بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

لمعات

اسلامی بینکاری

مشہور اخبار روزنامہ نوائے وقت کی مورخہ تین جون 2007ء کی اشاعت میں اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام دوروزہ اسلام آباد میں منعقد کانفرنس میں منظور کی گئی سفارشات کے حوالے سے خبر شائع ہوئی ہے کہ

کسی بھی شخص یا گروپ کو قوانین کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دیئے جانے کا اختیار نہیں ہونا چاہئے۔

دولت کی تقسیم منصفانہ ہونا چاہئے اور حکومت انسانی زندگی کی بنیادی سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنائے۔

اسی خبر میں رباء کے ضمن میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کو نمایاں جگہ دی ہے کہ رِباء ہر شکل میں استحصال ہے۔ تاہم رباء سے بچنے کے لئے اسلامی بینکاری کے نام پر جو متبادل نظام وضع کیا گیا ہے وہ رباء سے بھی زیادہ استحصال ہے۔ اس سے گریز کیا جائے۔ گریز چونکہ مطلق حکم ہے اس لئے اس میں ''تمام ادارے جو اس کی اجازت دیتے' اجازت لیتے یا اس کی حق میں فتویٰ دیتے ہیں'' سب شامل سمجھے جائیں گے۔

رباء کا نظریہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رباء ہر شکل میں استحصال کا نظریہ اسلامی نظریاتی کونسل نے قرآن کی درج ذیل آیت سے لیا ہے جس میں رباء سے توبہ کی حکمت میں کہا گیا ہے کہ اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرنے کے مرتکب ہوتے ہو اور نہ کوئی دوسرا تم پر۔

و ان تبتم فلکم رء وس اموالکم ج لا تظلمون ولا تظلمون O وان کان ذو عسر ۃ فنظر ۃ الی میسر ۃ ط و ان تصدقوا خیر لکم ان کنتم تعلمون O (بقرہ 2:279-80)

اگر (رباء سے) توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے اصل مال تمہارا۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر اور اگر (مقروض) ہے تنگ دست تو مہلت دینی چاہئے کشائش ہونے تک اور (اصل مال بھی) بخش دو تو تمہارے ذات کے لئے خیر ہے' اگر تم کو سمجھ ہو۔

اس آیت میں نہ صرف رباء بلکہ اصل مال کا بخش دینا انسان کی ذات کے لئے خیر کا موجب قرار دیا گیا ہے حالانکہ سطح بین نگاہوں کو تو یہ معاشی طور پر نقصان کا سودا دکھائی دیتا ہے۔ اس بظاہر نقصان میں خیر کا پہلو دیکھنے کے لئے قرآن یہ شرط عائد کرتا ہے کہ یہ وہی دیکھ سکتے ہیں جن کو سمجھ ہو۔

اسی سمجھ یا علم کا اندازہ مشہور اولین فلاسفر سقراط کے اس مشہورِ زمانہ مقولہ ''خیر (فضیلت) علم ہی ہے'' سے لگایا جا سکتا ہے۔ خیر کو علم سے مماثل بیان کرنے سے سقراط کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انسان اس وقت تک نیک عمل کر ہی نہیں سکتا جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ خیر اصل میں کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ سقراط نے مزید وضاحت کی کہ ''ایک عالم جو خیر کی اصل حقیقت سے واقف ہو چکا ہو' شر کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے سقراط نے یہاں عالم کو قرآن کے تصورِ ''مومن'' کے مترادف کے طور پر بیان کیا ہے۔

(2) خیر' جس سے ہمارے ہاں مستعمل لفظ اختیار نکلا ہے' کا تعلق انسانی ذات سے ہے جو آزادیِ اختیار کی حامل ہے۔ انسان کی جسمانی (طبیعی) زندگی حیوان سے ارتقاء یافتہ خارج سے طبیعی جبلت کے اصولوں کے مطابق چلنے میں مجبور ہوتی ہے۔ انسانی ذات کی حد میں البتہ انسان اپنی عقل اور ارادے سے انتخاب کر کے اعمال تخلیق کرتا ہے ان پر نظریہ خیر و شر کا اطلاق ہوتا ہے۔ (ا) انسان اپنی جسمانی زندگی کی حد تک کسی قسم کے دینے (Contribute) کی حالت میں نہیں ہوتا اور اپنی جسمانی زندگی میں خارج سے امداد (لینے کی حالت کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ذات کی حالت میں وہ دینے (Contribution) صلاحیت رکھتے ہوئے دینے کی اس قسم کی نوع کے اعمال میں نشو ونما حاصل کرتا ہے۔

نظریہ خیر و شر فلسفہ کا نہایت اہم موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہمارا بینکاری کا موضوع چونکہ اسلام سے منسلک ہے اس لئے ہم نے خیر کے علم میں ابھی جس اساسی اور بنیادی اصول کا ذکر کیا ہے اس کی تائید میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں گے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ صلاحیتوں کی نشو ونما سے انسان کے اختیار (خیر) میں وسعتیں آتی ہیں۔ قرآن نے اس ضمن میں اس نشو ونما کی طرف لے جانے کے سب کی طرف راہنمائی میں یہ اصول سامنے لایا ہے۔

الذی یوتی مالہ یتزکی (الیل 92:18)۔

وہ شخص جو ہر اس چیز (مال یا صلاحیت) کو جو اس کے پاس ہے' دیتا ہے تاکہ تزکیہ (ذات کی نشو ونما) حاصل کرے۔

اس نیت سے ایتاء کی روش سے' قرآن سے ہمیں راہنمائی ملتی ہے' انسانی ذات کی جو نشو ونما ہوتی ہے اسی سے اس کی کامیابی و کامرانی (خیر کی صورت میں) نمایاں ہوتی ہے۔

قد افلح من تزکی (الاعلیٰ 87:14)

جس نے تزکیہ (ذات کی نشوونما) حاصل کرلیا وہی کامیاب ہوتا ہے۔

درج بالا مختصر بحث کا مقصد قرآن کے اس دعویٰ ''ضرورت مند کے قرض کو معاف کر دینے Contribution کی روش میں انسانی ذات کا خیر مضمر ہے۔'' کا علمی جائزہ لینا تھا۔ قرآن' کلام الٰہی ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ضابطہ حیات ہے۔ اس کے مطابق بقا (یا خیر ونشوونما) اسی نظریہ کو ہے جو پوری انسانیت کے لئے منافع بخش ہو۔

واما ما ینفع الناس فیملث فی الارض۔ (الرعد 13:17)۔

ارض (دنیا) میں بقا اور دوام اس کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔

اس اصول کی روشنی میں استحصال پر مبنی رباء سے مکمل اجتناب کے قرآن کے صریح فیصلہ میں اسلامی ذہن میں اس کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ ہمارے اس دور میں معیشت بجنہ ایک دو غیر اسلامک ملکوں کے پوری نوع انسانی میں نظامِ سرمایہ داری کے اصولوں کے مطابق چل رہی ہے۔ اس میں مارکیٹ مسابقت کے باہمی رضامندی کے اصولوں کے تحت طبقات کا وجود تسلیم کیا جاتا ہے جس میں خود غرضانہ استفادہ یعنی استحصال (Expliotation) کی واضح دستوری اور قانونی اجازت دی جاتی ہے۔ اس استحصال کی موجودگی سے قرآن کی اصطلاح ربٰو اور نظام سرمایہ داری مترادف اصطلاحات کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ اب اس نظام کی عالمی قبولیت کے پیشِ نظر اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا ممکن نظر نہیں آ رہا ہے۔ چھٹکارہ حاصل کرنا تو کجا صاحب اقتدار کے ایوانوں ایسی خواہش بھی نظر نہیں آتی' جو کسی مقصد کے حصول کے لئے اولین شرط ہے۔ اگر ایسی خواہش عوام میں بیدار ہونے کے ممکنات کا اندیشہ ہو' تو ہم اپنے ملک پاکستان کی تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اسے دبانے میں ہر حیلہ سے کام لیا ہے۔ پاکستان میں بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ملک کے صدر جنرل ضیاء الحق کی سرکردگی میں رباء سے نظامِ سرمایہ داری میں رہتے ہوئے چھٹکارہ حاصل کرنے کے پروگرام کا عملی طور پر آغاز ہوا۔ ربٰو کو ملک کے بینکاری نظام کا حصہ قرار دیتے ہوئے اسے سود پر مبنی (Interest Based Banking) نظام سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا مقصد تعین کیا۔ لہٰذا اس نظام کا نام تبدیل کر کے بلا سود بینکاری (Interest Free Banking) قانونی طور پر متعارف کرا کے سود سے چھٹکارہ کا فتویٰ حاصل کرلیا۔

مجھے یاد ہے کہ ان دنوں میں ایک قومی بینک میں نائب صدر تھا۔ ہمیں پروفیسر طاہر القادری سے لکھوائے گئے فتویٰ بلا سود بینکاری کی کتاب کی معقول کاپیاں سٹاف میں تقسیم کرنے کے لئے بھجوائی گئی۔ ان کے فتویٰ کا متن ان کی کتاب کے صفحہ نمبر 81-80 سے یہاں درج کرنا چاہوں گا۔

''دفع ربٰو کے مقصد کے لئے 'Purchase with Buy-back agreement' اور Sale with purchase-Back agreement کا طریق کار اپنایا جا سکتا ہے۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی فریق کسی دوسرے شخص سے کوئی چیز خرید کر اسی کو واپس اضافی (اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق استحصال پر مبنی) قیمت کے ساتھ فروخت کر دے یا کسی کو کوئی چیز بیچ کر پھر اسی سے اضافی قیمت کے ساتھ خرید لے۔ اس طریقے سے واپس اضافی قیمت پر بیچنے یا خریدنے سے ہر دو فریق کو حسبِ حال سرمائے کے ساتھ مطلوبہ منافع بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور قرض کے بجائے معاملہ بیع کے باعث ربٰو سے بھی فرار حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کو ''دفع ربٰو'' یا ''اسقاطِ ربٰو'' کا حیلہ کہتے ہیں اور سود سے نجات کی نیت کے ساتھ کی گئی بیع (حیلہ) از روئے شرع حرام بھی نہیں ہوتی۔ یہ مخصوص احکام حدیثِ نبوی ﷺ کے علاوہ فقہ اسلامی کی متعدد کتابوں میں درج ہیں۔''

اس اور انہی جیسے فتاویٰ سے اس وقت کی حکومت کے قانون کو مذہبی سند حاصل ہو گئی۔ اس لئے اس پر تبصرہ کرنا کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ قرآن سے ہمیں البتہ اس تبدیلی نام کے متعلق درجِ ذیل ہدایت ملتی ہے۔

ما تعبدون من دونه الا اسماء سميتموها انتهم واٰبائوكم ما انزل الله بها من سلطٰن ان الحكم الا لله۔ (یوسف 12:42)۔

کچھ نہیں عبادت کرتے سوائے اس کے مگر نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے۔ نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند۔ حکومت نہیں ہے کسی کے سوائے اللہ کے۔

قرآن کی اس اصولی ہدایت کے پیشِ نظر میں نے فاضل مصنف کی پوری کتاب میں اللہ کی سند میں قرآن کا حوالہ ڈھونڈنا شروع کیا تو مجھے صرف ایک جگہ اس کا حوالہ مل گیا۔ اسے مصنف نے اپنی کتاب کے صفحہ 52 میں درج کیا ہے۔ جسے ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

''3۔ نظام حسن القضاء (قضاء احسن کا نظام)

شریعت نے سودی قرضہ جات کے تصور کو ختم کر کے اس کے بدل کے طور پر قرضِ حسنہ کے ساتھ ''حسن القضاء'' کا نظام عطا کیا ہے۔ جس کی بنیاد قرآن کا حکم احسان اور نبی اکرم ﷺ کی سنت مبارکہ ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

هل جزاء الاحسان الا الاحسان (الرحمان 55:60)۔

احسان کا بدلہ احسان ہی ہے۔

اس ارشادِ ایزدی کے مطابق معاملہ قرض میں جانبین کی طرف سے احسان نہ صرف جائز بلکہ فعلِ مستحسن ہے۔''

اس طویل اقتباس سے یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں احسان کا بدلہ احسان میں معاملہ قرض میں جانبین کی طرف سے احسان (اضافہ) کے تصور میں فاضل مصنف منفرد ہیں۔ انہی کے جماعت علماء میں داخل شیخ الہند محمود حسین مفسر جیسے لوگ اسے نیک بندگی کا بدلہ نیک ثواب (خدا کی طرف سے عطا کردہ) ہی سمجھتے ہیں۔ یہاں فاضل مصنف کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے کہ وہ یہاں بلاسود بینکاری کے حق میں قرآن کا نام شامل کر کے اپنی ساکھ (Market Value) میں اضافہ کے خواہاں ہیں چاہے اس آیت کا تعلق موضوع سے بنتا ہے یا نہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔

راغب نے مفردات القرآن میں وضاحت کی ہے کہ:

الاحسان (افعال) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا (یعنی اس کی کمی پورا کر کے اس کا توازن درست کر دینا) دوم یہ کہ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسن علم اور حسن عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں احسان میں نگاہ واجب (Due) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد' توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن سے مزید وضاحت حاصل ہوتی ہے کہ احسان کے عمل میں ایک جانب اگر یہ کہا گیا ہے۔

لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (الامر 76:9)۔

ہم تم سے کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں۔

دوسرے مقروض کی جانب جس میں قرض ادا نہ کرنے کی سکت ہے اسے مسائل اور محروم کے طبقے کی نمائندگی میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ:

و فی اموالھم حق للسائل والمحروم (الذٰریت 51:19)۔

اوران (ضرورت سے زیادہ سرمایہ رکھنے والوں) کے مال میں سائل ومحروم کا حق ہے۔

لہٰذا ایسے حالات میں مال میں بڑھوتری تو کجا خود ان کے مال کو وہ بطور حق طلب کر سکتے ہیں۔

پروفیسر طاہر القادری اور انہی کے قبیل کے علماء ومشائخ کے فتوؤں کے حصول کے بعد حکومت نے سودی بینکاری کی سہولتوں کو بلاسود بینکاری کی اصطلاح سے متعارف کرانے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اسے اسلامی نام دینے کی جرأت نہ کر سکے اور نہ ہی اس حد تک جانے کے لئے فتویٰ حاصل کر سکے۔ عصرِ حاضر کی صدی کے آغاز ہی میں بینکاری میں منافع میں غیر

معمولی اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس کشش نے ہمارے دور کے علماء نے متقدمین کی منافقت پر مبنی احتیاط کی دیوار گرا کر اسی بلا سودی کو اسلامی بینکاری کی سند عطا کر دی ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی اب باقاعدہ اسلامی بنک کے نام سے لائیسنس عطا کئے جا رہے ہیں۔

اسلامی بنک کا نام استعمال کرنے والوں کے لئے سند کا تقاضہ کرنے والوں کو مطمئن کرنے کے لئے حکومت کے اجازت نامہ کی کاپی ہی کافی ہے۔ اس کے باوجود مزید احتیاط برتتے ہوئے انہوں نے حکومت کے منظور شدہ شریعہ بورڈ کے مفتیانِ گرامی کی خدمات کو بھی معقول مشاہرہ پر حاصل کیا ہوا ہے اور اس کی تلقین انہیں حکومتِ وقت سے بھی ملتی ہے۔ وہ عندالضرورت اسلامی نظریاتی کونسل کے مطابق استحصالی سود کو عین اسلامی نام دینے کے لئے حاضر رہتے ہیں۔ بقول بنک انتظامیہ کے اس معقول مشاہرہ کے عوض خدمت بجالانے میں لائن میں لگے ہوتے ہیں۔ قرآن نے شاید اسی طرف راہنمائی کی تھی۔

یٰایھا الذین امنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ ط والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ لا فبشر ھم بعذاب الیم۔ (التوبہ 9:34)۔

اے ایمان لانے والو! ان احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک سزا کی خبر دو ان کو جو سونے اور چاندی (مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی بتلائی ہوئی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

اس آیت میں اللہ کی راہ سے روکنے کے ضمن میں مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں وضاحت کی ہے کہ ظالم صرف یہی ستم نہیں کرتے کہ فتوے بیچتے ہیں بلکہ مزید برآں اپنی اپنی اغراض کی خاطر یہ حضرات خلقِ خدا کو گمراہیوں کے چکر میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ایوانِ اقتدار نوعِ انسانی کے رائج الوقت نظام سرمایہ داری سے باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کی خواہش ہے کہ وہ اس استحصالی نظام کی سہولتوں سے بھی بہرہ مند ہوتے جائیں اور اسی نظام میں رہتے ہوئے دفع ربوٰ کی سکیمیں تیار کرتے رہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ عصرِ حاضر کا نظامِ سرمایہ داری ہی قرآن کا تصورِ ربوٰ ہے۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کی موجودگی میں دفع ربوٰ منطقی طور پر ناممکن خیالِ خام ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PREFACE

The author, Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq had close association with Mr. Ghulam Ahmed Pervez for last thirty five years since 1949 till the death of Baba Jee. Before and after joining the army General Sahib was known as a Maulvi due to his religious inclination and had graduated with honor in Arabic and secured top position in Govt College Lahore.

General Sahib (a name for which he was known in his circle) choose & lead his life on his terms with strong commitment and conviction in Quran. He was particularly very frank and generous with his subordinates and was very popular among his circle due to his simplicity, straight forwardness. He was also known as an exceptional figure for refusing to apply/avail any legal perks attached with his rank and died at the age of 83 years without owning/having any property.

These qualities also appears in his unpublished book **"Quranic Value System"** the Preface and Conclusion of which is being published as hereunder.

I can distinctively recall a day in December 1949. I was a Major in the Army, on leave at home in small town, playing cards with school friends under a shady tree. A friend of my father's, in fact his colleague in the Deputy Commissioner's office, threw at me an Urdu journal named TOLU-E-ISLAM. Having graduated with honors in Arabic, I was known to be a keen student of Islam and the Quran. I had extensively read books and articles by many Muslim scholars but this journal was new to me. Actually this December issue of the journal consisted entirely of a rather long essay on reasons for the decline and fall of the Muslim *Ummah*, a popular topic of discussion in those days, the writer Mr. Ghulam Ahmed Pervez, was also not known to me. This day changed my life.

Mr. Pervez argued that when the Muslims started to believe that material progress in this world *(Dunya)* was not of much consequence and that the real aim in life should be spiritual development to ensure a meaningful life after death *(Akhirah)* naturally they started to neglect life in this world. They were, therefore, left far behind in the race for peace, progress and prosperity in this world.

The most important point made by Mr. Prevez was that the Quran was a clear, precise and easy book to understand. It was complete by

itself. It did not need the services of any other book to complete it or to explain any ambiguities because no such ambiguities existed. Of course, a very good knowledge of Arabic as spoken and written in the times of Holy Prophet Muhammad (Peace be upon him) was a prerequisite for a correct comprehension of the book. I agreed with the writer. The more the Quran is studied in this manner, the better I started to absorb the Quranic teachings.

On retirement from the Army in 1972, I settled down in Karachi for a rather extended stay as a confectioner and baker. In 1973, on the initiative of some dear friends, we set up a discussion group consisting of businessmen, doctors, engineers, teachers, lawyers and intellectuals in general. Their wives, many of them very well educated and most of them quite vocal, also formed part of this group, informally called the Wednesday *Daras* Group. For over twenty years, we have been meeting once, sometimes twice a week to critically examine Quranic Teachings in great detail. Most of the time, I acted as a leader of this discussion group chiefly because I knew Arabic language a little more than the others. We all learnt a great deal from each other's understanding of the Quranic value system during the course of these discussions. We generally agreed that the Quran gives practical and highly useful permanent values to guide humanity in individual and collective life. I promised my group that some day I would enumerate the Quranic Values that we have been discussing for so long. This book is a humble fulfillment of that promise. I am grateful to the *Daras* group that they urged me on to complete this task. I hope it will act as a catalyst for other thinking people to study the Quran in a meaningful manner.

All references in the book are to the Quran (½ means *surah* 1, verse 2). I have consulted many translations of the Holy Quran. The translation quoted in the book is sometimes an exact copy of a certain authors' translation. Much of the time, I have introduced some of my own understanding, so as to reflect the method of Quranic comprehension as briefly stated in the introduction to the book.

MAJOR GENERAL (RETD)
IHSAN-UL-HAQ MALIK
(Karachi April 1995)

==========

CONCLUSION

Let me conclude. A lot of sound planning and hard, consistent work has gone on to create this universe. Forces of nature work under strict discipline, in a predictable manner determined for them, to run the universal machinery in smooth way. An inexhaustible treasure of provisions has been spread about the universe to sustain comfortable life for generations to come. This is God's, or if you prefer, nature's free gift to man. It would be a great pity if humanity did not appreciate this gift. It would be in its personal interest if it would harness its energies in a constructive manner and in harmony as mankind. It should exploit these bounties and make use of them to set up a peaceful and prosperous living. To shun the joys of this world, as some philosophies would have us do, would be tantamount to denying ourselves the pleasure so readily available.

These pleasures could be enjoyed to their maximum extent only if humanity decided to proceed about it as one entity. Humans have been given a free choice. They can live together as one family, sharing the comforts and hardships they create for themselves. Or individuals, tribes, nations or groups of nations could work in their best selfish interest only to ensure peace and prosperity for themselves even though, at times, it may be at a cost to others. Understandably, such course of action might create conflicts. A study of history of civilization shows that humanity has been trying to live in peace as a community throughout the ages. Wise people have been offering their advice on adoption of certain rules for individual and collective life to ensure elimination of conflicts. In the process, mankind has learnt through centuries of war and peace.

Amongst the wise men mentioned above, there have been many in most parts of the civilized world who have proclaimed that they are messengers of God. Many people do not feel that any interference from the outside is called for when formulating value systems for human conduct. While they are welcome to their views, Islam contributes to that concept where a broad, permanent value system is given by God rather than evolved by human intellect. Islam encourages humanity to live by the law. They are perfectly at liberty to choose the law they wish to live by.

Such laws should be clearly defined and publicly announced so that other participants in the game of life are aware of what they are dealing with. Islam has the highest respect for all wise people, whether messengers of God or otherwise, who have contributed their thoughts for framing a philosophy of life. While contributing its own humble bit in this pool of knowledge, it invites people of different philosophies to come together on a minimum common program in the first instance. As they work together at peace with each other they are likely to learn from each other and hopefully enlarge the common ground among themselves. This is the spirit in which this book has offered Islamic permanent values in various fields of individual and collective life.

Two things are immediately noticeable in this list of permanent values. One is that it is a very short list. For a way of life which claims to be operative for all times to come, it has quite appropriately very few details to offer. Surely, this is how it should be. The universe is constantly changing. Scientific discoveries bring about changes in life style ever so often. Humanity must respond with new rules of the game of changing times. A touch of the permanence is necessary to bring about and maintain a minimum common program of action by entire humanity on a long-term basis. Within a permanent structure, details will differ from place to place and time to time. Permanence, provided restricted to minimum, is also helpful in promoting stability in law. An example might help. The Quran has prescribed the death penalty for a proven, deliberate murder, for all times to come. People who do not believe in permanent values have been varying in their response to this crime. The death penalty has been imposed on occasions, eliminated at other times and then re-imposed after some thought and experience. So long as it is done in good faith, it is understandable because humans learn from experience. God offers to help. He suggests that He be trusted to make a good decision for His people. It will help lend stability to law. The Quran does claim that after a lot of trial and error, humanity will come round to the idea of a death penalty for a proven, deliberate murder. Trial and error is, perhaps, an exercise in futility when a feasible alternative is available.

In this short list of permanent values, it stands out that there are relatively large number of values governing family life. This would appear to be so because God lays great stress on harmony in homes and also

feels that changes in life styles over centuries will make relatively little impact on home life. History has proved this premise to be correct. Harmony or lack thereof in home lives has led to rise and fall of nations in the past. As it is today, the West with its mastery of science, technology and good values in many spheres of life, appears to be vulnerable on the homefront. God has offered "no sex outside marriage" as a permanent value. Non enforcement of this innocuous looking value is resulting in major evils in society. Non payment of attention to it will surely result in major disasters in the future.

The second noticeable thing about this list is the discovery that humanity has many values in common. I must have missed out a few values mentioned in the Quran but let me assure you they will not be too many. Notice how many of these agree with proclaimed value systems of other religions, wise men or philosophical schools of thought. If all schools of thought were to draw up a list of their value systems, humanity might discover that they have little to fight about. Of course, there are differences. These should be resolved in a peaceful, rational manner. Of course, each ideology, including Islam, claims that their value system is the best of them all. Remaining within an agreed common framework let each ideology live according to its own wish and let others live according to theirs. History of civilization, so far, indicates that man is quite capable of learning from each other. Take slavery as an example. Nations and countries have a long history of denial of freedom and dignity to man. Some very wise people in the past have termed slavery as an essential ingredient of society. It has brutally been practiced in some very highly developed countries in the recent past. But it is nearly universally recognized as an evil in modern times. Surely, this is a tribute to humanity, learning from experience.

The main aim of this book is to suggest to the Muslim world that making Islamic laws in modern times is possible. The whole Muslim world believes in ONE Quran. It is possible to draw up a list of "Limits of Allah". This foundation would serve as the common platform on which each Muslim country would build a structure suitable for themselves. To draw up common programs, applicable to all Muslim countries, they already have a very well established old institution – Hajj. It would serve them well if they made use of this. It would promote unity amongst the Muslim

countries because they have agreed upon "Limits of Allah" as their common foundation. Within each Muslim country, it is imperative for it to agree on a method of legislation. I have suggested one method in this book.

Unity of Muslim countries must lead to unity of the world. Most ideologies including Islam, have been advocating this since the advent of civilization. In modern times, all countries, developed and under-developed alike, have realized that peace and prosperity on earth are only possible when all countries live in accordance with an agreed upon set of rules. Islam has a very fine value system to offer. Let the Muslims define it in a rational way and present it in the forum of United Nations. But the Muslims have to agree among themselves in the first instance. This book is a humble contribution with that aim in view.

==========

ادارہ طلوع اسلام کے نئے چیئرمین

(مختصر تعارف)

جنرل کونسل کی میٹنگ مورخہ 18 مارچ 2007ء میں ڈاکٹر انعام الحق کا بالاتفاق ادارہ طلوع اسلام کا بطور چیئرمین انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔ انہوں نے اپنے عہدہ کا چارج مورخہ 2 مئی 2007ء کو سنبھال لیا ہے۔ ان کے مختصر سے تعارف میں بتایا جانا مناسب ہوگا کہ ان کی تحریک طلوع اسلام سے وابستگی کا عرصہ چالیس سال سے زیادہ تک محیط ہے۔ محترم پرویز صاحب کی ان کے بڑے بھائی میجر جنرل (مرحوم) احسان الحق سے ذاتی دوستی کی وجہ سے ہمارے موجودہ چیئرمین کی پرویز صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی جس کی وجہ سے فہم قرآن میں آسانی اور اس وجہ سے رغبت میں اضافہ ہونا ناگزیر تھا۔

محترم ڈاکٹر انعام الحق 35 سال بینک میں سروس کے بعد 1997ء میں بطور ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کے ریٹائر ہوئے اور جب سے انہوں نے اپنی پوری توجہ مزید علم کے حصول پر مبذول کی ہوئی ہے۔ اس اثنا میں انہوں نے 2006ء میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں اسلامک سٹڈی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامک سٹڈی میں ان کی مخصوص فیلڈ قرآن اور فلاسفی رہے ہیں۔

اس تحریک کے لئے انہوں نے اپنی خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ ہر مہینہ کے شروع میں ہفتہ اور اتوار کو لاہور میں ادارہ طلوع اسلام کے دفتر 25 بی' گلبرگ 2' لاہور اور مہینے کے بقایا دنوں میں اسلام آباد اپنے گھر کے پتہ' مکان نمبر 302' گلی نمبر 57' سیکٹر F-11/4 میں ملاقات کے لئے موجود ہوں گے۔ ادارہ کے فون نمبر اور ای میل کے علاوہ درج ذیل فون اور پتہ پر بھی تحریک کی بہتری کی تجاویز کے سلسلے میں رابطہ میں رہیں گے۔

اسلام آباد: مکان نمبر 302' گلی نمبر 57' سیکٹر F-11/4' اسلام آباد۔

فون نمبرز: 7321 210 0900, 229 (51-92+)' موبائل: 0333-5489276

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com

مباہلہ۔۔دینی و مذہبی نقطۂ نظر سے

کچھ عرصہ سے، لال مسجد، اسلام آباد کے متعلق میڈیا پر مسلسل خبریں آ رہی ہیں۔ اس مسجد کے خطیب اور نائب خطیب، دونوں حضرات کے بیانات اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ مشہور انگریزی اخبار ''دی نیوز'' مورخہ 31/05/2007 میں مولوی عبدالعزیز صاحب خطیب مسجد ہذا، کا ایک بیان طبع ہوا ہے جس میں انہوں نے مسجد کے تنازع کے بارے میں چند باتیں کی ہیں۔ منجملہ اور گفتگو کے حضرت اقدس نے یہ بھی فرمایا۔

"and I am ready for Mubahala in this regard"

(ترجمہ) ''اس (مسجد) کے سلسلہ میں میں مباہلہ کے لئے تیار ہوں۔'' یہ اخبار انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے پڑھنے والے زیادہ تر ''جنٹلمین'' حضرات ہوتے ہیں۔ اور ان کی مذہبی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ اس بات کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ ان حضرات کی اکثریت نے اس خبر کو پڑھا تو ہوگا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکے ہوں گے کہ اس لفظ سے حضرت اقدس کا کیا مطلب ہے۔ ممکن ہے کہ میڈیا کے اکثر حضرات نے بھی اس لفظ کو پہلی مرتبہ ہی سنا ہو، اور اس اصطلاح سے بالکل ناواقف ہوں۔ یہ رسالہ چونکہ دینی و قرآنی ہے اس لئے اس کو اس مسجد کے موجودہ تنازع سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ البتہ جو گفتگو یا جو امور خلاف قرآن کئے جاتے ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنا یہ رسالہ ضروری سمجھتا ہے۔ اسی لئے یہ مضمون حاضر خدمت ہے۔

عقل انسانی کی ہر دور کی موجودہ سطح کے مطابق، اور خارجی سہاروں اور پابندیوں کو Impose کئے بغیر قرآن کریم کو تفسیر القرآن بالقرآن کے ذریعے جب سمجھا جاتا ہے، تو یہ انسانی عقل میں مزید وسعت بھی پیدا کرتا ہے اور دنیا کے اس دور کے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے لیکن جب آپ اس کو خارجی سہاروں کا پابند کر دیں اور اس کو تفسیر القرآن بالقرآن کے بجائے روایات کا پابند بنا کر روایات کے ذریعے سمجھنا چاہیں، تو آپ کی فکر میں وسعت نہیں ہوسکتی۔ روایات جو آج سے ایک ہزار سال پیشتر جمع

کی گئی تھیں' ان کے مطابق جو تفاسیر تحریر کی گئی تھیں' وہ بھی اسی دور کی علمی سطح کے مطابق تھیں۔ آج بھی آپ ان ہی روایات کے ذریعے تفسیر کریں گے' تو وہ تفسیر اسی سابقہ دور کی علمی سطح کے مطابق ہوگی۔ ان تفاسیر کے ذریعے موجودہ دور کے تقاضوں کا حل نہیں مل سکتا۔ نہ تو وہ تفاسیر ہمارے دور سے (معلق) Relevant ہیں نہ ان میں ہمارے مسائل کا حل ہے۔

ہماری سابقہ تفاسیر میں مباہلہ کا تذکرہ بہت تفصیل سے آتا ہے ان تمام ''مستند'' تفاسیر میں کچھ معمولی جزوی اختلاف سے قطع نظر' سب نے تفصیلات تک میں اتفاق کر کے ایک ہی بات بیان کی ہے۔ یہاں ''مباہلہ'' کے متعلق بہت اختصار سے تحریر کیا جاتا ہے کہ پہلے قارئین کرام اس اصطلاح سے واقف ہو جائیں پھر اس پر تبصرہ پیش کیا جائے گا۔

فتح مکہ کے بعد حضورﷺ نے دعوتِ اسلام کے لئے کچھ وفود ارسال کئے ایک وفد نجران بھی گیا۔ وہاں کے عیسائیوں نے دلائل سنے تو حضورﷺ سے بحث کرنے کا خیال ان کو پیدا ہوا۔ 24 ذی الحجہ 10 ہجری کو ان کا ایک وفد جو چالیس آدمیوں پر مشتمل تھا واردِ مدینہ ہوا اور حضورﷺ سے اصرار کیا کہ ہم مناظرہ کریں گے۔ چنانچہ حضورﷺ ان کو کئی روز تک سمجھاتے رہے مگر وہ نہ مانے اور یہ طے پایا کہ مباہلہ کیا جائے۔ مباہلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ہر فریق یہ کہتا ہے کہ اگر میرا حریف اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے تو یا اللہ تو اس پر عذاب نازل کر' جب مباہلہ طے پایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

چنانچہ حضورﷺ مباہلہ کے لئے نکلے اس طرح کہ امام حسنؓ کی انگلی پکڑے ہوئے تھے اور امام حسینؓ کو گود میں لئے ہوئے۔ حضرت فاطمہؓ ان کے پیچھے تھیں اور حضرت علیؓ ان کے پیچھے۔ جب نصاریٰ کے پادری کی نظر ان حضرات پر پڑی تو اس نے اپنے گروہ کو مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ ان سے ہرگز مباہلہ نہ کرنا۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اگر محمد کو اپنی صداقت پر یقین نہ ہوتا تو وہ اپنے کنبے کو ساتھ نہ لاتے۔ چنانچہ انہوں نے مباہلہ سے گریز کیا اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔

میں نے اس واقعہ کا صرف ملخص تحریر کیا ہے ورنہ ہماری تفاسیر میں یہ بہت طویل وعریض لکھا گیا ہے اور صفحے کے صفحے اس واقعہ کے بارے میں کالے کئے گئے ہیں اور ہماری پیشوائیت کو اس نے اس طرح متاثر کیا ہوا ہے کہ ہمارے تمام علماء اس کے قائل ہیں۔ ماضی قریب میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے مخالف علماء کو بار بار مباہلہ کے لئے للکارا۔ ہمارے دور میں علامہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے اپنے مخالفین کو منٹو پارک میں مباہلہ کی دعوت دی تھی۔ یہ بات بیان کرنے کے لئے کہ تمام علماء کا اس واقعہ پر اتفاق ہے' ایک واقعہ تحریر کرنا' غیر مناسب نہیں ہو

گا۔

قبل پاکستان حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم علیٰ الترتیب جمعیت العلماء ہند وجمعیت العلماء اسلام سے وابستہ تھے۔ ان میں پہلی جمعیت پاکستان کے خلاف اور دوسری پاکستان کے موافق تھی۔ دونوں حضرات ہندوستان کے نہایت بلند پایۂ علماء میں شمار ہوتے تھے لیکن سیاسی مسالک کے اختلاف کی وجہ سے ذاتی تعلقات بھی کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے۔ مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم جو مولانا عثمانی کے حقیقی خواہر زادے تھے لیکن سیاسی طور پر کانگریسی ہونے کی وجہ سے مولانا مدنی کے بہت قریب تھے اور ان کے کیمپ میں شمار ہوتے تھے انہوں نے دونوں حضرات میں مفاہمت کرانے کی بہت کوشش کی' لیکن سب بے سود ثابت ہوئی۔ اس زمانے میں سیاسی نوعیت کے جلسے ہوتے رہتے تھے اور سارا ماحول سیاسی ہوتا تھا۔ ہر وقت ہر جگہ' سیاسی گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ ایک جلسہ سہارنپور (بھارت) میں ہوا جس میں مولانا عثمانی نے مسلم لیگ کی حمایت کی اور پاکستان کے قیام کے موافقت میں دلائل دیئے۔ تقریر کے دوران زور خطابت میں مولانا مدنی کو ''مباہلہ'' کی دعوت دے دی۔ اس واقعہ کی خبر مولانا مدنی کو ہوئی' انہوں نے جمیعت العلماء کا ایک جلسہ اسی مقام پر کرنا طے کیا جس جگہ مولانا عثمانی تقریر کر چکے تھے۔ چنانچہ مولانا مدنی نے تقریر شروع کی اور دورانِ تقریر فرمایا کہ مولانا عثمانی نے اپنی تقریر کے دوران مجھے جو ''مباہلہ'' کا چیلنج دیا ہے تو وہ مجھے منظور ہے۔ میں 'مباہلہ' کے لئے تیار ہوں۔ نیز فرمایا کہ مولانا عثمانی کے تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے وہ 'مباہلہ' میں کس کو لے کر آئیں گے اور واقعہ بھی یہی تھا کہ مولانا عثمانی کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ واقعہ صرف اس وجہ سے تحریر کیا گیا ہے کہ قارئین کرام کو اندازہ ہو سکے کہ ہمارے وہ علماء کرام جو نہایت بلند پایہ تھے اور جن کا شمار نجوم السماء میں ہوتا تھا وہ کس طرح اس غیر قرآنی تصور کے حامل تھے اور اب موجودہ دور کے علماء بھی ان خلافِ قرآن عقائد کو مانتے ہیں۔

اب اصل موضوع یعنی اس آیۂ کریمہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جس کا شان نزول اختراع کر کے یہ نظریہ بنایا گیا ہے۔ فمن حاجک فیه من' بعد ما جاء ك من العلم فقل تعالوا ندع ابناء نا وابناء کم و نساء نا و نساء کم والنفسنا وانفسکم قف ثم نبتهل فنجعل لعنة الله علی الکذبین (3/61)۔ پس جو تم سے اس بارے میں حجت کریں اس کے بعد کہ تمہارے پاس صحیح علم آ چکا ہے' تو ان سے کہو کہ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں' تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں' تم اپنی عورتوں کو جمع کرو' ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں' تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو' پھر ہم مل کر دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت

بھیجیں۔(ترجمہ از تدبرِ قرآن)

آیہ کریمہ اور اس کا ترجمہ آپ ملاحظہ فرمائیں' اس کی بہت مختصر ترین تفسیر شاہ عبدالقادر صاحب کی ''موضح القرآن'' سے دی جاتی ہے کہ یہ مختصر ترین ہے۔

''جب یہ آیت خدا تعالیٰ نے بھیجی' تب حضرت محمد ﷺ نے ان ہی (یعنی نجران) نصاریٰ کے عالموں کو بلا کر فرمایا کہ جتنا میں تمہیں سمجھاتا ہوں اور دلیلیں مضبوط سناتا ہوں تم زیادہ جھگڑتے ہو اور دشمن ہوتے ہو' اب آؤ' ہم تم اس طرح قسم کریں اور جھوٹوں پر لعنت کریں خدا کی' تو سچا اور جھوٹا سب پر معلوم ہو' نصاریٰ کے عالموں نے یہ بات قبول کی اور راضی ہوئے اور ایک دن ایک مکان مقرر کیا۔ اور دوسرے دن حضرت محمد نے حضرت حسین کو گود میں لیا اور حضرت امام حسن کا ہاتھ پکڑا اور حضرت فاطمہ زہرا کو اپنے پیچھے' اور حضرت مرتضیٰ علی کو ان کے پیچھے لے کر چلے اور فرمایا ان سب کو کہ جب میں دعا مانگوں' تو تم چاروں آمین کہیو۔ انہوں نے قبول کیا اور ادھر جو نصاریٰ کے بڑے بڑے عالم آئے اور ان کو دیکھا اور پکارا اپنی قوم کو کہ اے یارو' ان کے مقابلے سے ڈرو۔ جو ہم پہ کئی صورتیں دیکھتے ہیں۔ اگر یہ خدا سے دعا کریں تو پہاڑ زمین سے اکھڑ کر اڑ جائے۔ اگر تم ان سے مقابلہ کرو گے تو ایک نصرانی زمین پر نہیں رہے گا۔ آخر کو صلح اس بات پر ٹھہری جو ہر برس میں دو بار دو ہزار دینار' اور تیس زرہ دیا کریں گے جزیہ۔ یہ بات لکھ کر صلح ٹھہری اور نصاریٰ نے جزیہ دینا قبول کیا اور مقابلہ نہ کیا۔''

(تفسیر موضح القرآن' مطبوعہ لاہور' صفحہ 57)

اس روایتی تفسیر میں چند نکات غور طلب ہیں۔

(1) نصاریٰ کے علماء نے ان مقدس حضرات کے صرف چہرے دیکھ کر ہی یہ اندازہ کر لیا کہ یہ حضرات سچے تھے۔ ان کے نزدیک یہ وہ حضرات تھے کہ ان کی دعا سے پہاڑ بھی زمین سے اکھڑ سکتے تھے لیکن تعجب و تحیر ہے کہ نصاریٰ کے وہ علماء ان حضرات کی اس درجہ عظمت تسلیم کرنے کے باوجود خود مسلمان نہیں ہوئے اور جزیہ دینے پر صلح کر لی اور سال بہ سال وہ یہ جزیہ دیتے رہے جس کی تفاصیل ہماری تفاسیر میں درج ہیں۔

(2) جزیہ کا لفظ قرآن کریم میں صرف ایک جگہ 9/29 میں آیا ہے۔ وہاں اس بات کی صراحت ہے کہ جزیہ صرف قتال کے بعد مفتوح لوگوں سے لیا جا سکتا ہے' جزیہ لیا ہی اس لئے جاتا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ مفتوح ہو گئے۔ مثلاً اس دور میں دوسرے ملک کو فتح کرنے کا دستور ہی ختم ہو گیا ہے اب کسی پر بھی جزیہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پاکستان کے قیام کے بعد جو غیر مسلم یہاں آباد ہیں اور

جنہوں نے پاکستان کی حکومت کی اطاعت ازخود تسلیم کر لی ہے ان پر جزیہ نہیں لگایا جا سکتا۔ موضوع روایات کے مطابق نجران کے یہ نصاریٰ بھی قرآنِ کریم یا اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور اس پر تحقیق کرنے کے لئے مدینے شریف آئے تھے اگر انہیں اسلام پسند نہیں آیا تو ان پر کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ جبراً ایمان لائیں۔ وہ قتال کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ تعجب یہ ہے کہ ان سے جزیہ کی ادائیگی پر یہ معاملہ کس طرح طے پا گیا۔

(3) یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہ اپنی دعوت کے سلسلہ میں دوسروں پر لعنت کریں اور بددعا کریں قرآن نے کہا لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین (26/3)' ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا رہا ہے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ کسی رسول کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ اپنے مخالفین کے لئے بددعا کرے گا' مقام رسالت کی توہین ہے۔

(4) یہ بھی کوئی مسلمان تسلیم نہیں کر سکتا کہ حضورﷺ اللہ تعالیٰ کا یہ تصور رکھتے تھے کہ اس کی لعنت یا اس کے عذاب کو دعا سے Invoke کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قوانین ایک خاص نظام کے ماتحت چل رہے ہیں۔ بددعا کرنے سے مخالف کو نقصان پہچانے کا تصور بچوں کا سا تصور ہے بھلا ایسا تصور حضورﷺ کیسے کر سکتے تھے۔

(5) جو بنیادی غلطی ہمارے سب مفسرین کرام نے اس آیۂ کریمہ کے بارے میں کی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ندعوا کا مطلب مندرجہ حضرات کو عملاً جسمانی طور پر کسی خاص مقام میں حاضر کرنا شمار کیا ہے۔ حالانکہ کے دعوۃ میں عملاً کسی کا موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قل هذه سبيلي ادعوا الى الله قف على بصيرة (12/108)۔ (اے رسول) کہدو میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ مزید ارشاد ہوتا ہے۔ ثم انی دعوتهم جهاراً (71/8)۔ پھر میں نے ان کو بالاعلان بلایا۔ اس قسم کی بے شمار آیات پیش کی جا سکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دعوۃ میں جسمانی طور پر کسی مقام پر حاضر ہونا ضروری نہیں ہے۔ 'دعوت' کا مفہوم صرف اپنے نظریات کو پیش کرنا' اور ان نظریات پر عمل کرنے کا طریقہ واضح کرنا ہے۔ عملاً کسی کو کسی خاص مقام پر بلانا نہیں ہے' جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں ظاہر کیا گیا ہے۔

(6) اس آیت میں سب سے زیادہ تحیر انگیز بات یہ ہے کہ اس آیت میں جو لفظ نبتهل آیا ہے' اس سے مباہلہ کا لفظ بنتا ہی نہیں۔ اس لفظ کا مادہ (ب ہ ل) ہے یعنی بَہَل ہے اس مادہ کو باب افتعال میں لاکر نبتهل ہوتا ہے جو آیت میں استعمال کیا گیا ہے۔ مباہلہ کا لفظ اس باب سے آتا ہی نہیں۔ مباہلہ تو مفاعلہ کے باب سے آتا ہے جس کا اس آیت سے دور دور کا تعلق نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے

کہ ہمارے علماء نے اس آیت سے مباہلہ کا لفظ کس طرح بنا لیا۔ ہمارے علماء عربی کے بہت ماہر ہوتے ہیں معلوم نہیں کہ ان کی نگاہ اس طرف کیوں نہیں گئی۔ نظریات میں تو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن عربی قواعد تو سب کو تسلیم کرنے ہوتے ہیں۔

(7) ''مباہلہ'' حق و باطل کا معیار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ مباہلہ کے نتائج فوری طور پر برآمد نہیں ہوتے۔ مباہلہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو فریق ایک دوسرے کے لئے بددعا کرتے ہیں کہ دوسرا فریق جو جھوٹا ہے' اس پر اللہ کی لعنت ہو' اب لعنت کی کوئی واضح شکل مقرر نہیں ہے۔ مباہلہ کرنے والے اس کی عملی شکل یہ قرار دیتے ہیں کہ جھوٹا فریق' سچے فریق سے پہلے فوت ہو جائے گا۔ یہ ان کے نزدیک اللہ کی لعنت کی عملی شکل ہے۔ فرض فرمائیں کہ اگر یہ دوسرا فریق دس سال بعد فوت ہوا' تو دس سال تک جو لوگ گمراہ رہے ان کی گمراہی کو ذمہ دار کون ہے؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا فریق کسی ایسی حالت میں فوت ہو کہ اس سے واضح ثبوت نہ حاصل ہو سکے۔ کوئی وبا پھیل جائے اور ہزاروں آدمی اس میں فوت ہو جائیں اور دوسرا فریق بھی اس میں فوت ہو جائے' تو اس فریق کے حامی یہی کہیں گے کہ یہ بددعا کی وجہ سے فوت نہیں ہوا بلکہ اس وبا کے اثر سے فوت ہو گیا۔ مذہب میں چونکہ نتائج اس دنیا میں سامنے نہیں آتے' اس لئے مذہب میں تو مباہلہ چل سکتا ہے لیکن دین میں مباہلہ نہیں چل سکتا۔ اب آپ کے سامنے اس آیت کا دینی مفہوم پیش کیا جائے گا تو یہ بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔

چونکہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو قرآن کریم کے الفاظ کا قرآنی مفہوم اور دوسرے تصریفِ آیات۔ اس لئے پہلے الفاظ کا قرآنی مفہوم پیش کیا جاتا ہے پھر تصریف آیات کے ذریعے اس کا درست مفہوم۔

'مباہلہ' کا مادہ بَہَلَ ہے۔ اس کے بنیادی معنے آزاد ہونا ہے' یہ لازم و متعدی دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بَہَلَہٗ یا اَبْہَلَہٗ دونوں کے معنے میں' اسے اس نے چھوڑ دیا۔ آزاد کر دیا۔

اس میں دوسرا قابل غور لفظ لعنت کا ہے۔ لَعَنَ کا لغوی معنے محروم کرنے کے ہیں۔ جب یہ خدا کی طرف منسوب ہو گا' اس کے معنے ہوں گے اللہ کے قانون کی خوشگواریوں سے محروم ہونا۔ ملائکہ کی لعنت کے معنی ہیں کائنات کے قوانین کو مسخر نہ کرنے کی وجہ سے ان کے فوائد سے محروم ہونا۔ کوئی قوم ایتھر کو مسخر نہیں کرتی تو وہ قوم ایتھر کے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہے۔ 'الناس' لوگوں کی ملامت (2/161) کا مطلب ہے ان تمام انسانوں کے تعاون سے محروم رہنا جن کو کسی معاملہ میں ان کا ساتھ دینا تھا۔

قرآنِ کریم نے قانونِ مکافاتِ عمل کو دین کی

بنیاد کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِعملوا علی مکانتکم انی عامل ج فسوف تعلمون لا من تکون له عاقبة الدار ط انه لا یفلح الظلمون (6/135)۔ (اے رسول) تم ان سے کہدو کہ اے میری قوم تم جو چاہو کرو، میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ پھر عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دارِ آخرت کس کے لئے ہے اور ظالم کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اسلام چونکہ مذہب نہیں ہے بلکہ دین ہے۔ مذہب میں نتائج آخرت میں نکلتے ہیں لیکن دین میں نتائج اسی دنیا میں سامنے آتے ہیں۔ حضورﷺ ایک ضابطۂ حیات لائے۔ آپ نے اس ضابطۂ حیات کی صداقت وحقانیت کے دلائل دے کر ثابت کیا کہ اسلام کا ضابطہ حیات بہترین ضابطہ ہے۔ لیکن جب مخالفین نے اس کو عقلی طور پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو حضورﷺ نے ان کو تجویز فرمایا کہ اب وہ اس ضابطۂ حیات کی صداقت کو اس طرح آزمائیں کہ وہ خود تو اپنے ضابطہ پر عمل کرتے رہیں، اور حضورﷺ کو قرآن کے ضابطہ کے مطابق عمل کرنے دیں۔ نہ تو مسلمان ان کے ضابطہ میں دخل اندازی کریں گے نہ وہ مسلمانوں کے ضابطہ قانون میں روڑے اٹکائیں (نیتھل)۔ دونوں ضابطے اسلام و جاہلیت کے برابر کام کرتے رہیں۔ کچھ ہی عرصہ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس ضابطہ کے نتائج اچھے برآمد ہوئے اور کون سا ضابطہ اللہ کے قوانین کے خوشگوار نتائج سے محروم ہوتا ہے (لعنت) اور یہ ضابطے اس طرح روبہ عمل لائے جا سکتے ہیں کہ دونوں فریق کے لوگ، اپنے متعلقین، بیوی بچوں سمیت الگ الگ معاشروں میں رہیں۔ پھر ایک دوسرے کو آزاد چھوڑ دیں۔ ایک دوسرے میں دخل نہ دیں۔ نتائج خود بخود سامنے آ جائیں گے۔

اب آپ آیہ کریمہ کا واضح مفہوم، مفہوم القرآن میں درج شدہ ملاحظہ فرمائیں۔

اگر علم وحقیقت کے بعد بھی یہ لوگ یونہی جھگڑتے چلے جائیں تو ان سے کہدو کہ میں اس معاملہ میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورت میں ہماری روش یہ ہوتی ہے کہ ہم کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے آپ کو، اپنے مردوں اور عورتوں سمیت الگ کر لیتے ہیں (یعنی تنہا میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ میری جماعت کے افراد بھی) تم اسی طرح اپنے لوگوں کو لے کر الگ ہو جاؤ۔ نہ تم ہمارے معاملات میں دخل دو اور نہ ہی ہم تمہارے معاملات میں مخل ہوں۔ ہمارا عملی پروگرام ہے۔ اس کے نتائج خود بتا دیں گے کہ ہم میں سے کون جھوٹا ہے اور کون سچا۔ جھوٹا زندگی کی ان خوشگواریوں سے محروم رہ جائے گا جو حق وصداقت کی راہ پر چلنے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ (مطالب القرآن، جلد 4، صفحہ 142)

آپ نے ''مباہلہ'' کا مذہبی اور دینی مفہوم

ملاحظہ فرمایا۔ مذہبی مفہوم میں تو کسی طرح بھی طے نہیں ہوسکتا کہ کون سچا ہے۔ البتہ دینی مفہوم میں جب دونوں نظاموں کے نتائج اسی دنیا میں برآمد ہوں گے' تو ان نتائج سے ہر شخص خود بخوبی دیکھ سکتا ہے کہ کون سا نظام درست ہے۔

آیت کریمہ کے اس قرآنی مفہوم کے بعد' آپ مرزا قادیانی اور ہمارے علمائے کرام کے مباہلہ کے چیلنج کو ملاحظہ فرمائیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کو چیلنج کرتے تھے۔ لال مسجد کے سیاسی و انتظامی پہلو سے ہمیں کوئی تعرض نہیں۔ البتہ مولانا صاحب نے جو چیلنج دیا ہے اس سے واضح نہیں کہ حکومت کے کس افسر کو انہوں نے چیلنج کیا۔ کون انہیں بددعا دے اور کس کو یہ بددعا دیں گے۔ اور جو فریق ہار جائے وہ جزیہ کس کو دے۔ اور غلط و صحیح کا فیصلہ کون کرے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

راج کمار ہردیو اور امیر خسروؒ کا ایک مکالمہ

حضرت امیر خسروؒ تو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں البتہ دیوگڑھ کے راج کمار ہردیو اتنے معروف نہیں ہیں' اس لئے ان کا تعارف مختصر الفاظ میں مفید مطلب رہے گا۔ علاؤالدین اپنے چچا اور خسر فیروز شاہ کو قتل کر کے 1295ء میں تختِ دہلی پر قابض ہوا اور 1315ء تک متمکن رہا۔ علاؤالدین خلجی دہلی سے ایک ہزار میل دور کرناٹک تک پہنچ کر دیوگڑھ پر قابض ہوا۔ اسی دیوگڑھ کے معاصر راجاؤں کے فرزند ہردیو' سیتل دیو' چیتل دیو اور سنبھل دیو کا ذکر تاریخ میں آتا ہے جو حضرت سلطان الاولیاء کے حلقۂ ارادت میں شکست خوردگی کے بعد' داخل ہوئے۔ سلطان الاولیاء کی مجلس میں حضرت امیر خسرو بھی حاضر رہتے اور ہردیو بھی۔ ہردیو ڈائری بھی لکھا کرتا تھا جس میں وہ روزمرہ کے واقعات اور ملفوظات درج کر لیتا تھا۔ ایک دلچسپ گفتگو آپ بھی سنئے۔ اس مکالمے سے آپ کو بہت سی پتے کی باتیں معلوم ہوں گی۔ صوفیاء اور بادشاہوں کے تعلق کے مختلف گوشے سامنے آئیں گے اور مسلم بادشاہوں کی دین اور دُنیا میں دوئی (سیکولرازم) قائم رکھنے کا مقصد بھی سمجھ میں آجائے گا اور یہ فیصلہ کرنے میں بھی آسانی ہو جائے گی کہ ماضی کے مسلمان بادشاہ ہمارے ''اسلامی ہیرو'' کہلائے جانے کے کہاں تک مستحق ہیں!
مکالمہ حاضرِ خدمت ہے: (محمد سلیم اختر)

ہردیو۔ میں نے کہا حضرت (سلطان الاولیاءؒ) دن بھر روزے رکھتے ہیں اور رات کو فقط جو کی روٹی کھاتے ہیں' اس سے ان کی جسمانی طاقت بہت کم ہو جانے کا ڈر ہے۔

حضرت امیر خسرو نے جواب دیا۔ خدا کی یاد ان کے جسم کی طاقت کے لئے کافی ہے۔

ہردیو کہتے ہیں۔ میں نے امیر خسرو سے علاء الدین خلجی کی برائی کرنی شروع کی اور کہا کہ وہ بہت ہی برا بادشاہ ہے۔

امیر خسروؒ نے میری بات سنی تو وہ بہت ہنسے اور انہوں نے کہا ''ہردیو تو نے کبھی کسی ڈاکو کو دیکھا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ایک نہیں بہت سے ڈاکو دیکھے ہیں۔ امیر

خسرو نے پوچھا ڈاکو کس کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا جو دوسروں کا مال لوٹ لے اور جان لے لے' عورتوں اور بچوں پر رحم نہ کرے اس کو ڈاکو کہتے ہیں۔

امیر خسرو نے مسکرا کر کہا کہ اور تو نے یہ بھی سنا ہو گا کہ ڈاکو سوائے اس گناہ کے کہ وہ دوسروں کا مال لوٹ لیتے ہیں اور بغیر رحم کے دوسروں کو مار ڈالتے ہیں اور زخمی کر دیتے ہیں' اور برائیاں ان میں نہیں ہوتیں مثلاً وہ اپنا لوٹا ہوا مال غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ دیتے ہیں' مہمانوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے ہیں' لاوارث عورتوں اور بچوں کی مدد کرتے ہیں اور ہر وقت خدا کی مخلوق کو فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں۔ خدا کی عبادت کرتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں اور اگر ہندو ہوں تو ہمیشہ مندروں میں جاتے ہیں۔ گنگا میں نہاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ ان ڈاکوؤں کی یہ اچھی باتیں اچھا کہنے کے قابل ہیں یا نہیں۔؟

میں نے جواب دیا۔ ''جو اچھی بات ہے وہ اچھی بات ہے اور جو بری بات ہے۔ وہ بری ہے۔ پس ڈاکہ مارنا برا ہے اور جتنے کام آپ نے بتائے وہ سب اچھے۔

امیر خسرو نے کہا کہ اگر میں کسی ڈاکو کے نیک کاموں کی تعریف کروں تو تم یہ تو نہیں کہو گے کہ وہ ڈاکو ہے بے رحم ہے۔ اس کی اچھی بات کی تعریف نہ کرو۔ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ سب بادشاہ ڈاکو ہوتے ہیں اور بہت بڑھیا قسم کے ڈاکو ہوتے ہیں۔ دوسروں کا ملک چھین لیتے ہیں۔ ان کو مفلس و کنگال بنا دیتے ہیں اور ان کی عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے۔ مگر اس عیب کے سوا ان میں ہزاروں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ خیرات بھی کرتے ہیں' بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں' ننگوں کو کپڑے بانٹتے ہیں اور کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جب ان کو شک ہو جاتا ہے کہ کسی شخص سے ان کی بادشاہی کو خطرہ ہے تو پھر وہ رحم اور انصاف کو بھول جاتے ہیں۔ چاہے وہ شخص پیر ہو یا ان کا باپ ہو یا ان کی ماں یا ان کی اولاد ہو یا ان کا بھائی ہو۔ وہ کسی کی پروا نہیں کرتے اور سب کو فنا کر دینا اپنا بادشاہی کا ایمان و قانون سمجھتے ہیں۔

یہی حال علاء الدین خلجی کا بھی سمجھو کہ وہ بھی دنیا کے بڑے سے بڑے ڈاکوؤں میں سے ایک بڑا ڈاکو ہے۔

ہردیو! تم دہلی میں ابھی نئے آئے ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ خود مختار بادشاہوں کے پایہ تخت میں زندگی بسر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ چند روز کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ علاؤ الدین کے اکثر مصاحب اور اکثر بڑے بڑے امیر اور فوجی سردار میرے حضورؒ کے مرید ہیں۔ سوائے چند آدمیوں کے کہ وہ فقط بادشاہ کے مرید ہیں۔ اور بادشاہ کے سوائے ان کو خدا کی ضرورت ہے نہ رسول ﷺ کی ضرورت ہے وہ اگر کبھی خدا کو یاد کرتے ہیں تو فقط اس لئے کہ بادشاہ ان کو خدا پرست سمجھے' وہ رسولؐ سے محبت ظاہر کرتے ہیں تو اس لئے کہ بادشاہ کو بھی رسول ﷺ سے محبت

ہے۔ وہ دہلی کے پیروں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ زمین پر سر جھکاتے ہیں۔ ان پیروں کو نذریں دیتے ہیں۔ ان پیروں سے دعائیں کراتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بادشاہوں کی نوکری کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ایسے سب لوگوں سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ جن کا عوام پر اثر ہے۔ یہ ایک طرف پیروں کے قدموں میں سر رکھتے ہیں اور دوسری طرف بادشاہ کے یہاں اُنہیں پیروں اور بزرگوں کی مخبری کرتے ہیں۔

(بحوالہ ''پانی پت اور بزرگانِ پانی پت'' مولفہ سید محمد میاں)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل

تبدیلی

صدیوں سے مسلمان جن مشکلات کا شکار ہیں ان کا سبب اللہ تعالیٰ کے قوانین کی خلاف ورزی ہے' لیکن وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ غلطی پر ہیں۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کے اعمال اسلام کے عین مطابق ہیں کیونکہ ان کی نظر میں اسلام ایک مذہب ہے' جس پر عمل پیرا ہونے کے لئے دنیا کی کوئی مملکت روکاوٹ نہیں بنتی۔ ان کے نزدیک اسلامی مملکت اس لئے ضروری ہے کہ مذہبی رسومات کو ڈنڈے کے زور پر نافذ کیا جا سکے۔ دنیا میں ہونے والی ترقی یا فلاحی نظام مملکت سے انہیں کوئی سروکار اس لئے نہیں کہ ان کی نظر میں یہ دنیاوی باتیں ہیں۔

دوسری جس کوتاہی کو تسلیم نہیں کیا جا رہا وہ یہ کہ قرآن کریم کا نزول ہماری رہنمائی' ہدایت اور تمام مشکلات کے علاج کے لئے ہوا تھا۔ اسے سمجھے بغیر ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ محض پڑھ کر ثواب حاصل کرنا اس کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے تاریخ اور روایات کو بنیاد بنانا صحیح نہیں بلکہ ان کی صحت قرآن کریم کو بطور معیار ماننے سے مشروط ہے۔

اس لاعلمی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے اہل دانش اپنی اپنی فکر کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے کسی بھی مسئلے پر مختلف حل پیش کرتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بغیر اپنے تئیں حل تلاش کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اس وقت تک تجربات ہی کرتا رہے گا جب تک وہ اس حل تک نہ پہنچ جائے جو اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ ہے۔ اگر وہ براہ راست قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کر لے تو صدیوں کے عذاب سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ لیکن فی الحال ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ کسی نے قرآن کریم سے حل تلاش ہی نہیں کیا۔

وطن عزیز میں آج کل پھر بظاہر نظام لیکن درحقیقت چہرے بدلنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مختلف اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز پر مختلف سیاسی وغیر سیاسی شخصیات اپنی رائے کا اظہار کر رہی ہیں۔ افسوس کہ ان کی نظر سے اللہ تعالیٰ کا یہ چیلنج نہیں گزرا کہ:

''اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک اس قوم کے افراد اپنے نفس میں تبدیلی نہیں لاتے''۔(۱۳:۱۱)۔

جس ملک میں قانون کا احترام نہ تو عوام کرتے ہوں اور نہ ہی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے' جہاں کھلے عام قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ملی بھگت سے قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہو' جہاں کا عدالتی نظام مظلوموں کی بجائے ظالموں کے حق میں ہو اور جہاں کی پولیس جرائم ختم کرنے کی بجائے ان کی سرپرستی کرے وہاں کیسے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ سب اچھا ہو جائے۔ یہ صرف نفس میں تبدیلی سے ہی ممکن ہے۔ اگر فرق دیکھنا ہو تو پاکستان میں کسی بھی ایسے ٹریفک سگنل پر جہاں کوئی پولیس مین نہ ہو' تھوڑی دیر کھڑے ہو کر نظارہ کر لیں کہ کتنے افراد ہیں جو اس کا احترام کرتے ہیں اور پھر اس کا تقابل کسی بھی یورپی ملک سے کر لیں۔ وہاں کے لوگوں کو کیا شے مجبور کرتی ہے کہ وہ قوانین کا احترام کریں؟ دراصل ان کے نفس میں تبدیلی آ چکی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کا سگنل کی افادیت پر ''ایمان'' ہے۔ ہمارا ایمان تو محض زبانی ہے' ہم عمل کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔

لہٰذا اگر آج حکومت تبدیل ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا؟ افراد تو وہی رہیں گے اور وہی سب کچھ ہوگا جو پہلے سے ہو رہا ہے۔ عوام کی حالت ویسی ہی رہے گی' صرف کچھ مراعات یافتہ چہرے بدل جائیں گے۔ نظام بدلنے کے لئے افراد کی بجائے ان کی سوچ میں تبدیلی آنی چاہیے۔ معاشرے میں جو برائیاں عام ہیں ان کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جب تمام افراد دل سے انہیں برا جانیں اور انہیں یقین ہو کہ یہ سب ان کی ذات اور معاشرے کے لئے نقصان دہ ہیں۔ جس طرح انہیں زہر کے مہلک ہونے کا یقین ہے' اسی طرح تمام قرآنی اقدار کی خلاف ورزیوں کے مضر اثرات نکلنے پر بھی ایمان ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کا زبانی ایمان ان کے دلوں کی گہرائیوں میں نہیں اترتا' اسی لئے ان کے نفس میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی اکثریت بلا سوچے سمجھے اپنے مذہبی رہنماؤں کا اتباع کرتی ہے اور قرآن کریم کو سمجھ کر نہیں پڑھتی ورنہ ان کے سامنے یہ آیت ضرور آتی کہ:

''اے ایمان والو تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ بہت ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو''(۶۱:۲-۳)۔

اگر ہم اپنے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کے بیانات کا جائزہ لیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ دوسروں سے جو مطالبات کر رہے ہوتے ہیں' خود ان پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ اس کی تازہ ترین مثال گذشتہ کئی ماہ سے جاری وکلاء کی تحریک ہے جو عدلیہ کی آزادی کے لئے چلائی جا رہی ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوام کو انصاف کیوں نہیں ملتا؟

انصاف کا تقاضا ہے کہ مجرم کو سزا ملے' لیکن کیا وکلاء جانتے ہوئے بھی مجرموں کے مقدمات نہیں لڑتے ؟ وہ یہ جانتے ہیں کہ مقدمے کے فیصلے میں تاخیر سے کسے فائدہ پہنچتا ہے اسی لئے وہ یہ کام بخوبی انجام دیتے ہیں۔ اگر وہ فی الواقع عوام کو انصاف فراہم کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ابتدا خود سے کیوں نہیں کرتے ؟ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اعلان کیا کہ

''انا أول المسلمین''

وہ بھی اس پیغام پر ایمان لائے جو ان پر نازل ہوا۔ ان کا عمل بھی قرآن کے مطابق تھا۔ لہٰذا جب بھی کوئی شخص کسی مہم یا تحریک کے لئے اٹھے گا تو اس پر لازم ہوگا کہ وہ خود اس پر عمل پیرا ہو' ورنہ وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ اللہ کا قانون ہے۔

عوام الناس تو قرآن کریم کی تعلیمات سے بے خبر ہیں اس لئے ان کا عمل اس کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ قرآن کریم کو سمجھ چکے ہیں یہ ان کا فریضہ ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچائیں لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کے اعمال بھی اس کے مطابق ہوں ورنہ بہتر یہ ہے کہ وہ تبلیغ کا عمل سرانجام نہ دیں کیونکہ اس طرح وہ لوگوں کو کتاب اللہ کے قریب لانے کی بجائے دور کر دیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

عقل خود بین غافل از بہبود غیر
سود خود بیند نہ بیند سودِ غیر

علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی وضاحت میں منطق کا نظریہ مغطلہ (Delima) کے بازگشت کی مثالیں پیش خدمت ہیں۔

مغطلہ (Delima) کے بازگشت کی تین مشہور مثالیں عموماً درسی کتابوں میں دی جاتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) کہتے ہیں کہ قدیم یونان میں ایک ماں نے اپنے بیٹے کو سیاسی زندگی سے باز رکھنے کے لئے یہ مغطلہ پیش کیا۔

اگر تم سچ کہو گے تو لوگ تم سے ناراض ہوں گے اور اگر سچ نہیں کہو گے تو خدا تم سے ناراض ہوگا۔

یا تم سچ کہو گے یا سچ نہیں کہو گے۔

لہٰذا یا تم سے لوگ ناراض ہوں گے یا خدا ناراض ہو گا۔

اس لئے تم سیاست میں حصہ نہ لو۔

بیٹے نے اس مغطلہ کی مندرجہ ذیل بازگشت کی۔

اگر میں سچ کہوں گا تو خدا مجھ سے ناراض نہیں ہوگا اور اگر میں سچ نہیں کہوں گا تو لوگ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے یا میں سچ کہوں گا یا سچ نہیں کہوں گا۔

لہٰذا یا مجھ سے خدا ناراض نہیں ہوگا یا لوگ مجھ سے ناراض نہیں ہوں گے۔

اس لئے میں سیاست میں ضرور حصہ لوں گا۔

(۲) قدیم یونان کے مشہور ترین سوفسطائی پرطاغورس (Protagoras) کے پاس ایک نوجوان علم قانون پڑھنے کے لئے آیا۔ پڑھائی کی فیس کے متعلق استاد اور شاگرد میں یہ معاہدہ ہوا کہ آدھی فیس اس وقت ادا کی جائے گی جب شاگرد فارغ التحصیل ہو کر عدالت میں اپنا پہلا مقدمہ جیتے گا۔ شاگرد نے فارغ التحصیل ہو کر کوئی مقدمہ نہ لیا۔ استاد نے خیال کیا کہ شاگرد باقی ماندہ آدھی فیس سے بچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے آدھی فیس کے لئے شاگرد پر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا:

اگر یہ اس مقدمے میں ہار گیا تو اسے عدالت کے حکم کے مطابق میری فیس ادا کرنا پڑے گی۔ اور اگر یہ

مقدمے میں جیت گیا تو اسے ہمارے معاہدہ کے مطابق میری فیس ادا کرنا پڑے گی۔
یا یہ مقدمے میں ہارے گا یا جیتے گا۔
لہٰذا یا اسے عدالت کے حکم کے مطابق میری فیس ادا کرنا پڑے گی یا ہمارے معاہدے کے مطابق میری فیس ادا کرنا پڑے گی۔

شاگرد نے استاد کے مغطلے کے جواب میں مندرجہ ذیل بازگشت پیش کی۔

اگر میں اس مقدمہ میں ہار گیا تو اپنے معاہدے کے مطابق مجھے فیس ادا نہیں کرنا پڑے گی اور اگر میں مقدمہ میں جیت گیا تو مجھے عدالت کے حکم کے مطابق فیس ادا نہیں کرنا پڑے گی۔
یا میں مقدمہ میں ہاروں گا یا جیتوں گا۔
لہٰذا یا مجھے اپنے معاہدے کے مطابق فیس ادا نہیں کرنا پڑے گی یا عدالت کے حکم کے مطابق فیس ادا نہیں کرنا پڑے گی۔

(۳) ایک دفعہ ایک مگرمچھ نے ایک عورت کا بچہ پکڑ لیا۔ جب عورت نے مگرمچھ سے اپنا بچہ مانگا تو مگرمچھ نے کہا تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارا بچہ تمہیں واپس دوں گا یا نہیں۔ اگر تمہارا جواب درست ہوا تو میں تمہیں بچہ واپس دے دوں گا۔ اس عورت نے اس ڈر سے کہ اگر میں نے یہ کہا کہ تم میرا بچہ مجھے دے دو گے تو یہ میرے بچے کو کھا کر میرے جواب کو غلط ثابت کر دے گا' یہ جواب دیا کہ تم میرا بچہ مجھے واپس نہیں دو گے اور مندرجہ ذیل مغطلہ پیش کیا۔

اگر میرا جواب غلط ہے تو تمہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میرا جواب غلط ہے میرا بچہ واپس دے دینا چاہئے اور اگر میرا جواب درست ہے تو تمہیں اپنے وعدے کے مطابق میرا بچہ واپس دے دینا چاہئے۔
یا میرا جواب غلط ہے یا درست ہے۔
یا تمہیں میرے جواب کو غلط ثابت کرنے کے لئے میرا بچہ واپس دے دینا چاہئے یا اپنے وعدے کے مطابق میرا بچہ واپس دے دینا چاہئے۔

مگرمچھ نے اس مغطلہ کی یہ بازگشت پیش کی۔

اگر تمہارا جواب غلط ہے تو مجھے اپنے وعدے کے مطابق تمہارا بچہ واپس نہیں دینا چاہئے اور اگر تمہارا جواب درست ہے تو مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تمہارا جواب درست ہے بچہ واپس نہیں دینا چاہئے۔
یا تمہارا جواب غلط ہے یا درست ہے۔
لہٰذا یا تو مجھے اپنے وعدے کے مطابق تمہارا بچہ واپس نہیں دینا چاہئے یا مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تمہارا جواب درست ہے بچہ واپس نہیں دینا چاہئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

روایات اور شانِ نزول کا پروپیگنڈہ

قرآن کریم کے راستے میں بڑی بڑی سازشوں سے جو رکاوٹیں پیدا کی گئیں ان میں ایک عقیدہ شانِ نزول کا بھی ہے۔ قرآن کا کوئی سا تفسیری ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیں اس میں آپ کو لکھا ہوا ملے گا کہ یہ آیت فلاں صحابیؓ کی شان میں اور یہ آیت فلاں حضرت کی شان میں نازل ہوئی تھی، اس آیت یا حکم کا شانِ نزول یہ ہے۔ یہ شانِ نزول کیا چیز ہے اور یہ عقیدہ کیوں وضع کیا گیا؟

اللہ کے پروگرام کے مطابق وحی کا سلسلہ قرآن پر ختم ہوا اور نبوت نبی کریم ﷺ پر ختم ہوئی۔ دین کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اس میں تمام نوعِ انسان کے لئے ابدی طور پر یعنی قیامت تک کے لئے راہنمائی دی گئی ہے۔ دین کی تکمیل بھی ایسی کہ اس میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ناقص، نا تمام یا تشنہ رہ گیا ہو۔ یا یہ کسی خاص زمانے کے انسانوں تک محدود رہ گیا ہو۔ قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کے سامنے جو مسائل آنے تھے ان کے متعلق قرآن میں راہنمائی دیدی گئی اور مشیت نے جب یہ دیکھا کہ اب اِس کے بعد کسی مزید ہدایت، اصول قانون، پیمانے یا اقدار کی ضرورت نہیں ہے تو اس سلسلے کو بند کر دیا گویا یہ مشیت کے ایک پروگرام کے مطابق خدا کی طرف سے نازل ہوا اور اسی مشیت کے مطابق مکمل کیا گیا۔ نوعِ انسان کے لئے جو کچھ خدا نے دینا تھا وہ اسے دے دیا۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ جو کچھ (بطور ہدایت) خدا نے نوعِ انسان کو قیامت تک کے لئے دینا تھا وہ اسے وحی کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی وساطت سے قرآن میں دے دیا۔

حضور نبی کریم ﷺ کے اڑھائی سو سال بعد ایرانی، عجمی حضرات آئے انہوں نے اسلام میں داخل ہو کر شانِ نزول کا عقیدہ وضع کیا اور شانِ نزول کے من گھڑت واقعات اپنی اپنی حدیث کی کتاب میں درج کر دیئے۔ اب جو واقعہ انہوں نے لکھ دیا۔ آیت کے معنی اس کے مطابق کر دیئے گئے۔ وہی مفہوم لیا جانے لگا۔ قرآن کی ہدایات کو ان واقعات کے ساتھ پابند کر دیا گیا جو انہوں نے اپنے ہاں روایات میں درج کئے اور بعد میں آنے والے مفسرین نے بھی انہی کی کتابوں میں سے اخذ کیا کہ فلاں بات یا واقعہ اس طرح ہوا تھا یا فلاں نے فلاں کے ساتھ یہ کیا تھا تو اس

پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ اس طرح قرآن کی رہنمائیوں کو ان واقعات کے ساتھ پابند کر دیا گیا جو واقعات انہوں نے اپنی کتابوں میں درج کئے۔ سوچئے قرآن کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا۔ لیکن اصل حقیقت کیا ہے! ایک مثال کے ذریعے بات نکھر کر سامنے آجائے گی اور وہ یہ کہ مشیتِ خداوندی میں تھا کہ عورتوں کے لئے قیامت تک پردے کا حکم دیا جائے گا اور وہ حکم بھیج دیا گیا یعنی آیت نازل کر دی گئی۔ اس آیت میں یہ نہیں ہے کہ المومنات ننگے سر باہر نکلا کرتی تھیں یا دوپٹہ نہیں اوڑھا کرتی تھیں۔ ان جامعین روایات و احادیث نے اس کے شانِ نزول کے لئے اپنی کتابوں میں من گھڑت روایت درج کی جس میں لکھا گیا کہ بیبیاں بلا حجاب باہر نکلا کرتی تھیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے آکر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ اس طرح سے فتنہ پردازوں کو فتنہ برپا کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ ان کو باپردہ باہر نکلنا چاہئے۔ ان کی شکایت حضور ﷺ نے سنی تو اس پر پردے یعنی جلباب (چادریں) اوڑھنے کے حکم والی آیت نازل ہوئی۔ ایک روایت میں ہے کہ جب سورہ توبہ کی آیت کا جزو والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشر ھم بعذاب الیم (۹/۳۴)۔ نازل ہوا تو مومنین کو سخت ناگوار گزرا۔ حضرت عمرؓ نے نبی کریم ﷺ سے ان کا حال بیان کیا تو زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ اس طرح سرمایہ داری کے تحفظ میں مومنین کی ناگواری زکوٰۃ کے حکم کے شانِ نزول کا موجب بنا دی گئی۔ (روایت میں مومنین پہ ناگوار گزرا لکھ کر اصحابِ رسول ﷺ کے کردار پر بھی چوٹ لگائی جن کے متعلق قرآن میں ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔ (الانفال) یہ ہیں معنی شانِ نزول کے۔ اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ اگر یہ واقعات نہ ہوتے یا اگر حضور ﷺ سے شکایت نہ کی جاتی تو کیا پردہ اور زکوٰۃ کے احکام نہ دیئے جاتے جن کا دیا جانا امت مسلمہ کے لئے قیامت تک کے لئے مشیتِ خداوندی میں تھا؟

شانِ نزول کے عقیدہ کی رو سے ظاہر ہے کہ اگر یہ واقعات نہ ہوتے تو یہ احکام بھی نازل نہ ہوتے۔ قرآن آدھا رہ جاتا۔ سیدھی سی بات ہے۔ یعنی اس عقیدہ کی رو سے قرآن میں اللہ تعالیٰ کے پروگرام یا مشیت کے مطابق ہدایات نہیں دی گئیں بلکہ دنیا میں انسانوں نے آپس میں کچھ باتیں یا واقعات کئے تو ان واقعات کی وجہ سے خدا کی طرف سے احکام آگئے۔ یعنی قرآن مشیتِ خداوندی کے مطابق مرتب نہیں ہوا۔ خدا کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ۔ اس عقیدے نے قرآن، وحی، وحی کا مقصد، دین، دین کی تکمیل اور ختمِ نبوت ان سب سے دور رکھنے والا جو اثر ڈالا وہ قابلِ غور وفکر ہے۔ قرآن کریم نے اقوامِ گذشتہ اور انبیائے سابقہ کے جتنے بھی واقعات خود بیان کئے ہیں ان کا مقصد واقعہ نگاری نہیں بلکہ ان اقوام کے خود ساختہ غلط نظامہائے زندگی وقوانین کے تباہ کن نتائج کو بطور

تاریخی نوشتے کے سامنے لایا گیا ہے تاکہ ہم بلکہ قیامت تک آنے والے انسان ان سے نصیحت حاصل کر کے قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں۔

ایک موبائل فون میں بہت سے پروگرام یعنی فنکشن ہیں۔اس کے بنانے والے نے چھوٹی سی کتاب کے اندر ہر فنکشن کے متعلق ہدایت لکھ دی کہ یہ اس طرح کام کرے گا۔ ہر مشین کے بنانے والا مشین سے کام لینے کے لئے ساتھ کتاب لکھتا ہے کہ یہ کیسے کام کرے گی اور وہ کتاب کی قیمت وصول نہیں کرتا۔ نہ تو موبائل فون بنانے والے کو فون کے متعلق کتاب لکھنے سے پہلے کوئی دھماکہ کرنا پڑا اور نہ ہی مشین بنانے والے کو کتاب لکھنے سے پہلے کوئی کھڑاک کرنے کی ضرورت پیش آئی کیونکہ وہ اپنی اپنی تخلیق کردہ شئے کا علم رکھتے تھے۔اسی طرح خدا نے انسانوں کو پیدا کیا تو اس دنیا میں اجتماعی طور پر زندگی کی راہوں پر خطرات سے بچ کر چلنے کے لئے ہدایات' قوانین' اصول' احکام اپنی کتاب (قرآن کریم) میں بلا مزد و معاوضہ نازل کئے۔انسانوں کی راہنمائی کے لئے اللہ علیم کی کتاب کے نزول اور اس میں قوانین اور احکام و اصول دینے کے لئے واقعات و حوادث کا کیا کام؟

معزز قارئین سوچئے! یہ عقیدہ کیوں وضع کیا گیا؟ یہ خطرناک سکیم ہے اس سے قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے خلاف بڑی بڑی سازشیں کرنے کی گنجائش نکل آئی۔ سورہ النور اور سورہ الاحزاب کی دو آیات کی تفسیروں اور ان کی احادیث کی کتابوں میں ان آیات کے شانِ نزول کے تحت دو نہایت برگزیدہ ہستیوں کے متعلق ایسی بے حیائی کی باتیں لکھ رکھی ہیں جنہیں تحریر کرنے کی اجازت میری تو غیرت نہیں دیتی۔سورہ النور میں کسی کا نام نہیں ہے۔کاتا اور لے دوڑی جیسی خبروں اور افواہوں کے سلسلہ میں خدا کی طرف سے تحقیق و تفتیش کے لئے قیامت تک صرف اصول دیا گیا ہے لیکن ان ظالموں نے جھوٹے افسانے کے لئے اپنی اڑھائی سو سال بعد کی روایات اور تین سو سال بعد کی تاریخ و تفسیر میں نام لکھ رکھا ہے۔موجودہ زمانے کے نام نہاد علماء کرام بھی نہیں سوچتے کہ اس نشتر کی زد کہاں جا پڑتی ہے۔ یہ بھی جھوم جھوم کر بڑے فخر سے اس کی شہرت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مخالفین' مومنین سے نہایت طعن آمیز انداز سے کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کے پیچھے لگ رہے ہو جس پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔اللہ نے ان مخالفین کی جادو والی بکواس کی تردید میں فرمایا کہ: انظر کیف ضربوا لک الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا (۱۷/۴۸)۔اے رسولؐ! دیکھو یہ لوگ تمہارے متعلق کس قسم کی باتیں کرتے ہیں؟ ان کا یہی تعصب ہے جس کی وجہ سے یہ ایسی گمراہی میں پڑ چکے ہیں کہ اب سیدھی راہ پا نہیں سکتے۔(جس کی آنکھوں پر نفرت اور تعصب کی پٹی بندھی ہو' اسے سیدھی راہ نظر کیسے آ سکتی ہے؟)۔

جب دین کی تکمیل ہوگئی اور وہ غالب آ گیا اللہ نے سورہ الفلق میں فرمایا اے رسولؐ! اپنی جماعت سے کہو کہ اب تم نے آئندہ کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کرنی ہیں تاکہ یہ نظام ٹوٹ نہ جائے یہ مستحکم رہے اور آگے بڑھے۔ یاد رکھو! دنیا میں تمہارے مخالفین کی بڑی بڑی جماعتیں پیدا ہوں گی۔تم نے ایسا انقلاب برپا کیا ہے جس میں ان بڑے بڑے سرمایہ داروں' مذہبی پیشواؤں اور حکومتوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔تمہارے نظام کو ضعف پہنچانے کے لئے چاروں طرف سے یورشیں ہوں گی۔ جب ایسی یورش ہو اور خطرہ نظر آئے تو اپنے رب کے قوانین کی پناہ میں آ جانا یعنی ان پر اور شدت سے عمل پیرا ہو جانا۔ یاد رکھو! جماعت میں اس قسم کے منافق آ جایا کرتے ہیں کہ جونہی تم نے کسی کام کا ارادہ' عزم' فیصلہ کیا کہ یہ کرنا ہے وہ آ کر کسی نہ کسی طرح سے پھونک مارتے ہیں کہ تمہارا ارادہ متزلزل ہو جائے۔اس سے بچنا۔ یہ باہر والے نہیں ہوتے' اندر والے ہوتے ہیں۔تمہارے عزائم کی محکم گرہوں کو ڈھیلا کرنے کے لئے ایسی جماعتیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گی اور وہ اس قسم کی پھونکیں ماریں گی۔ جب پختہ عزم میں شک وشبہ پیدا ہو جائے تو پھر انسان ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا اس لئے جماعت کے اندر ایسے لوگوں سے محتاط رہنا۔(یہ تھا مطلب تعوذ اور نفث فی العقد کا)۔اس سے اڑھائی سو سال بعد شانِ نزول والے آ گئے جنہوں نے آ کر روایت کے ذریعے کفار کے پروپیگنڈہ کی تائید میں کہا کہ واقعی حضورﷺ پر گیارہ گانٹھ والے گنڈے کے ذریعے جادو چل گیا تھا جس کے اثر سے آپﷺ (معاذ اللہ) بہکی بہکی باتیں کرنے لگ گئے تھے اتنا بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ ایک کام کر لیا ہے یا نہیں۔ پھر جب اللہ نے گیارہ آیات والی آخری دو سورتیں نازل کیں تو ادھر حضورﷺ ایک ایک آیت پڑھتے جاتے ادھر ایک ایک کر کے گانٹھ کھلتی جاتی۔ جب آپﷺ نے گیارویں آیت پڑھی تو اس کالے دھاگے کی آخری گانٹھ ڈھیلی پڑ گئی اور حضورﷺ پر سے جادو کا اثر زائل ہو گیا اور بالکل نارمل ہو گئے۔ مذہبی پیشواؤں اور عامل حضرات نے اس روایت سے فائدہ اٹھایا۔انہوں نے اعوذ اور نفث کے شانِ نزولی مفہوم سے تعویذ لکھ کر اور کالے دھاگے کے گنڈے پھونک کر حفاظت کے لئے گلے میں لٹکانے اور چوکھٹوں سے باندھنے کے لئے بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا۔آج کل یہ بزنس زوروں پر ہے۔ٹی وی چینل کے پلیٹ فارم سے ٹی وی سکرین پر پیر بابے پھونکیں مارتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی ایک پھونک سے سینکڑوں ہزاروں میل دور بیٹھی خاتون کا پیائش شدہ کپڑا بڑھ جاتا ہے تو اس بے چاری کو کہا جاتا ہے کہ آپ پر کالا جادو چل چکا ہے۔ پھر علاج کے بہانے اس کا پرس خالی کر کے اس کے خاوند کے خون پسینہ کی کمائی لوٹنے کے لئے پرائیویٹ طور پر ملنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔اس بھولی' پرانی مرض میں مبتلا بیمار کو اتنا بھی علم نہیں ہوتا کہ اس کی اس ایک ٹیلی فون کال کے لئے دیر تک انتظار کرتے کرتے کتنے پونڈ

یا ڈالر پہلے ہی ان ظالموں کی جیب میں پہنچ چکے ہیں۔

بخاری شریف کی مختلف جلدوں میں مندرجہ بالا روایت کے متضاد' پانچ روایات ہیں اور ان روایات کے ایک ہی راوی ہیں لیکن ان کے اندر بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ ان سب روایات کے راوی کا نام ام المومنین عائشہؓ لکھا گیا ہے تاکہ اس میں شک وشبہ کا خیال تک کسی کے دل میں پیدا نہ ہو اور کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہنے کی جرات ہی نہ کر سکے۔ بخاری جلد نمبر ۷' روایت نمبر ۶۶۰' میں ہے کہ:

''اللہ کے رسول ﷺ پر جادو اثر کر گیا تھا اس لئے وہ خیال کیا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی بیویوں کا دورہ کر لیا ہے حالانکہ ایسا نہیں کیا ہوتا تھا۔ (سفیان نے کہا یہ سخت قسم کے جادو کی وجہ سے ہے)۔ پھر ایک دن آپؐ نے کہا اے عائشہؓ! کیا تمہیں معلوم ہے اللہ نے اس معاملہ کے متعلق مجھے کیا ہدایت کی ہے۔ میں نے پوچھا کس کے متعلق؟ دو آدمی میرے پاس آئے ان میں سے ایک میرے سر کے قریب بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے قریب۔ سر کی طرف بیٹھنے والے نے دوسرے سے پوچھا کہ اس شخص کو کیا خرابی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اس پر جادو کا اثر ہے۔ پہلے نے پوچھا ان پر جادو کس نے کیا؟ اس نے جواب دیا قبیلہ بنی ذوریق میں سے جھاڑ پھونک کرنے والے ایک آدمی لبید بن عاصم نے جو یہودیوں کا اتحادی تھا۔ پہلے نے پوچھا کیا چیزیں استعمال کی گئیں؟ دوسرے نے جواب دیا ایک کنگھی اور بال اس میں پھنسا کر۔ پہلے نے پوچھا وہ کہاں ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا نر کھجور کے درخت کے پولن کی چھال میں (In a skin of pollen of male date palm tree) پتھر کے نیچے دھروان کے کنویں میں۔ پس پیغمبرؐ کنویں پر گئے اور ان چیزوں کو باہر نکالا اور کہا یہ وہی کنواں تھا جو مجھے خواب میں دکھایا گیا۔ اس کا پانی مہندی چڑھے رنگ کی مانند نظر آتا تھا اور اس کے قریب درختوں کی کھجوریں شیطانوں کے سروں کی مانند تھیں۔ پیغمبر نے مزید کہا تب ان چیزوں کو باہر نکالا گیا۔ میں نے پیغمبر سے پوچھا کہ آپ اپنا علاج Nashra سے کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ نے میرا علاج کر دیا میں نہیں چاہتا کہ میرے لوگوں میں برائی پھیلے.....۔ اس سے اگلی روایت نمبر ۶۶۱ میں لفظی تضاد کے علاوہ بیویوں کا دورہ نہیں لکھا گیا بلکہ لکھا گیا ہے کہ آپ کوئی کام کر لیتے تھے تو خیال کرتے تھے کہ وہ کام نہیں کیا۔ آپ نے لمبی دعا کی تو پھر آپ ﷺ نے سب کچھ فرمایا اور لبید بن عاصم ایک یہودی تھا اور آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کنویں پر گئے تھے۔ آخر میں لکھا ہے کہ میں نے حضورؐ سے کہا کہ کیا

آپؐ نے پولن کی چھال میں لپٹی ہوئی اشیاء کو باہر نکالا۔ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ جب کہ اللہ نے مجھے شفا دے دی' میرا علاج ہوگیا اور میں ڈر گیا کہ اگر میں نے یہ چیزیں لوگوں کو دکھا دیں تو برائی پھیل جائے گی اس لئے میں نے حکم دیا کہ کنویں کو مٹی سے بھر دو اور وہ مٹی سے بھر دیا گیا۔''

جماعتِ اسلامی کے بانی مودودی مرحوم اپنے لٹریچر میں لکھتے ہیں کہ: یہ ساتویں ہجری کا واقعہ ہے جب حضورؐ صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ منورہ واپس تشریف لائے۔ یہودیوں کے کچھ لوگ مدینہ آئے اور وہ لبید بن عاصم سے ملے اور اس سے کہا کہ محمدؐ نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ انہوں نے جادوگر لبید بن عاصم جو کہ انصار کے قبیلہ ذوریق میں سے تھا کو سونے کے تین سکے دے کر حضور نبی کریم ﷺ پر جادو چلانے کو کہا۔ حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا کام کیا کرتا تھا۔ اس لڑکے کے ذریعے آپؐ کی کنگھی کا ٹکڑا اور بال منگوا کر لبید بن عاصم کو دیئے گئے۔ بعض کے نزدیک لبید بن عاصم کی بہن جو کہ جادو میں زیادہ تجربہ کار اور سخت قسم کے جادو میں ماہر تھی اس سے یہ کام کروایا گیا۔ آپؐ ایک سال تک اس جادو کے زیرِ اثر رہے۔ مودودی مرحوم مندرجہ بالا روایت والی کہانی لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ لوگوں کو اس کی خبر نہیں تھی کیونکہ حضورؐ حسبِ معمول زندگی بسر کرتے تھے۔ آپؐ کوئی کام کرتے تھے تو جادو کے اثر سے صرف انہی کو محسوس ہوتا تھا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ جب آپؐ کو خواب میں کنویں کا پتہ نشان معلوم ہوگیا تو حضورؐ نے صحابہ کرامؓ کو کنویں کا سارا پانی نکالنے کے لئے بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد آپؐ بھی وہاں تشریف لے گئے۔ کنویں میں پڑے ہوئے پتھر کے نیچے سے نر کھجور کے غلافِ خوشہ (Spathe) میں لپٹے ہوئے کنگھی کے ٹکڑے کو بال سمیت باہر نکالا گیا اس میں سے موم لگی ہوئی گیارہ گانٹھ والا دھاگہ بھی نکلا۔ ہر گانٹھ میں سوئی گڑی ہوئی تھی۔ جب اللہ نے جبریل کے ذریعے قرآن کی گیارہ آیات والی آخری دو سورتیں الفلق اور الناس نازل کیں تو حضورؐ ایک آیت پڑھتے تو اس دھاگے کی ایک گانٹھ ڈھیلی پڑ جاتی اور اس میں سے سوئی باہر نکال لی جاتی۔ اسی طرح جب ایک ایک کر کے گیارویں گانٹھ سے سوئی نکالی گئی تو حضور پر سے جادو کا اثر اتر گیا اور آپؐ ٹھیک ہوگئے۔

مودودی مرحوم آگے لکھتے ہیں کہ خدا کے پیغمبر پر جادو کا اثر ہوسکتا ہے اور یہ قرآن سے ثابت ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کو جادوگروں کی رسیاں سانپ بن کر دکھائی دینے لگی تھیں۔ کاش! مودودی مرحوم سے کوئی پوچھتا کہ اس میں جادو کے زیرِ اثر آنے والی کونسی بات ہے۔ قرآن کے مطابق موسیٰ علیہ السلام جو صرف ایک قوم کے نبی تھے وہ تو فرعون کے فریب کاروں پر غالب آ گئے تھے جب ان کا عصا ان کی رسیوں کو نگل گیا۔ موسیٰ علیہ السلام پر جادو کا اثر کیسے ثابت ہوگیا۔ دوسری طرف قیامت تک کے لئے تمام نوعِ انسان کے لئے رسول ﷺ اور خاتم النبیین کو صرف روایات

کی بنا پر جادو زدہ دکھایا گیا یہ سازش نہیں تو اور کیا ہے۔ مودودی مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ مندرجہ بالا روایات سورہ بنی اسرائیل کی آیت کے خلاف ہیں جس میں اللہ نے حضورﷺ پر جادو کی تردید کر رکھی ہے۔ لکھتے ہیں' لیکن تاریخ اور روایات کو بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ تاریخ پر تو سارا دارومدار ہے۔ ان کے نزدیک کوئی بات قرآن کے خلاف جاتی ہے جاتی رہے۔ ناموسِ رسالتؐ داغدار ہوتی رہے انہیں اس کا کچھ احساس نہیں۔ بخاری کا مرتبہ ان سے بلند ہے اس کی کسی روایت پر آنچ نہ آئے۔ ترمذی کی حدیث نمبر ۳۶۵۶ جس کے راوی ابو موسیٰ العشری ہیں میں ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی جادو میں یقین رکھے وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ مسئلہ صاف ہوگیا۔ بات ختم ہوگئی۔ یہ حدیث سو فیصد قرآن کے مطابق ہے۔ لیکن! اگر مودودی مرحوم کے سرغنوں نے فیصلہ جاری کر دیا کہ یہ حدیث ملحدوں کی وضع کردہ ہے یا مردود ہے اور ضعیف ہے تو.....۔

سورہ الفلق اور سورہ الناس کے متعلق یہ اختلاف بھی پایا جاتا ہے کہ آیا یہ سورتیں مکی ہیں یا مدنی۔ بعض کے نزدیک یہ مکی سورتیں ہیں اور بعض کے نزدیک مدنی ہیں لیکن مودودی مرحوم نے انہیں مکی سورتیں قرار دیا ہے۔ چونکہ ان کے مطابق جادو والی کہانی کا واقعہ ساتویں ہجری میں ہوا تھا اس کے لئے وہ دلیل یہ لائے کہ سورتیں تو مکی ہی ہیں لیکن جب آپؐ پر جادو چل چکا تھا تو جبریل آئے اور اس نے آ کر یہ سورتیں پڑھنے کا کہا تھا۔ بے شک جادو کا اثر زائل کرنے کے لئے الفلق میں صرف چوتھی آیت ہے۔ معاذ اللہ۔ معزز قارئین! ومن شر النفثت فی العقد سے مراد پیر بابوں کی گانٹھ کھولنے والی پھونکیں نہیں بلکہ اس سے مفہوم پروپیگنڈہ ہے جو کہ آج کل مغربی الیکٹرانک میڈیا کی طرف سے بالعموم اور مسلم ممالک کے ٹی وی چینلز پر بالخصوص اپنے آپ بن بیٹھنے والے علمائے کرام کی من گھڑت باتوں سے قرآن' اسلام' پیغامبرِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ زیادہ نہیں صرف ایک بات کو لیں۔ قرآن کے الفاظ میں خدا کی طرف سے عطا کردہ حضورﷺ کے معراجِ انسانیت پر فائز انتہائی بلند ترین مقام کو سامنے رکھتے ہوئے اذان کے بعد دعا پر غور کیجئے جسے ساری دنیا کے لوگ دن میں پانچ بار سنتے ہیں۔ سوچئے! جب غیر مسلم حضورﷺ کے لئے بلندی درجات اور مقام کی خاطر دعائیہ جملے سنتے ہوں گے تو وہ حضورﷺ کے مقام کا کیا تصور اپنے ذہن میں لاتے ہوں گے؟

قرآن کے متعلق شکوک وشبہات پیدا کرنے اور جادو کی کہانی کے اثبات کے لئے سورہ الفلق اور الناس کو ''معوذتین'' کہہ کر ایک گروہ نے یہ پروپیگنڈہ بھی کیا کہ یہ دونوں سورتیں قرآن کا جزو نہیں ہیں۔ (معاذ اللہ)۔ انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ معوذتین صرف حضورﷺ کے لئے تھیں تاکہ ان کے ذریعے جادو کا اثر زائل کیا جا سکے۔ ان کی طرف سے روایات کے ذریعے قرآن کے خلاف

اس سے بڑی سازش اور کیا ہوگی۔ یہ کچھ یہود نصاریٰ نے نہیں کیا تھا اندر آنے والے عجمیوں نے عربوں سے قرآن چھڑوانے اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کی خاطر کیا تھا۔ خدا نے دین یعنی قرآنی نظام کی حفاظت کے لئے ہدایات کے سلسلہ میں فرمایا کہ ومن شر حاسد اذا حسد۔ حاسدوں کے شر و حسد سے احتیاط برتنا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ آپ کے پاس ایک شئے ہے جو میرے پاس نہیں ہے۔ میری کوشش یہ ہے کہ وہ شئے آپ کے پاس بھی نہ رہے۔ عربی زبان میں اسے حسد کہا جاتا ہے۔ مخالفینِ قرآن و اسلام کا حسد شروع سے چلا آ رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مدرسوں والے تعلیمی نصاب میں سوائے سورہ البقرۃ کے قرآن شامل نہیں ہے۔ جہاں سے بھی قرآن کی آواز اٹھتی ہے یہ حاسد حضرات اس کے خلاف منکرِ حدیث کے لیبل کا جھنڈا بطور ہتھیار اٹھا کر اس کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں تاکہ قرآن کی تعلیم عام نہ ہو جائے۔ ان کا مقصد اس سے یہ ہے کہ پاکستان میں خالص قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ یہ کب تک دین کی راہ میں روک بنے رہے گے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایک نہ ایک دن نوعِ انسان نے نظامِ خداوندی کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اس کے بغیر ان کی مشکلات کا کوئی اور حل نہیں یہ خدا کا فرمان ہے۔ ذالک الیوم الحق فمن شاء اتخذ الی ربہ مابا (۷۸/۳۹)۔ یہ دور ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جس کے واقع ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ لہٰذا (ابھی وقت ہے کہ) جس کا جی چاہے خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنا نصب العین قرار دے کر اس کی طرف قدم بڑھائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(دوسرا باب)

سورۃ الفاتحۃ

(بسم اللہ اور آیت 1)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ کی نوعیت

عزیزانِ من! سلام ورحمت! سورۃ الفاتحہ کے درسوں کے جو Causes (اسباب) میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں‘ ان کا تعارف پہلی نشست میں کرایا جا چکا ہے۔ اب ہم سورۃ الفاتحہ کے درس کی ابتدا کرتے ہیں لیکن اس سے پہلے اُن الفاظ کو سامنے لانا ضروری ہے جو اِسی سورت کے آغاز میں نہیں بلکہ قرآنِ کریم کی ہر سورت کے آغاز میں لکھے اور پڑھے جاتے ہیں سوائے ایک سورت کے‘ جسے سورۃ التوبہ کہتے ہیں۔ اس سورت کی ابتدا میں یہ الفاظ اس لیے نہیں لکھے جاتے یا پڑھے جاتے کہ کہا جاتا ہے کہ یہ یقینی طور پر طے نہیں پا سکا تھا کہ سورۃ التوبہ ایک الگ سورت ہے یا سابقہ سورۃ الانفال ہی کا ایک حصہ ہے یعنی یہ ایک ہی سورت مسلسل چلی آتی ہے یا یہ ایک نئی سورت ہے۔ چونکہ یقینی طور پر یہ طے نہیں پا سکا تھا اس لیے انہوں نے یہ کیا کہ سورۃ التوبہ الگ رکھی۔ آٹھویں سورۃ الانفال اور نویں سورۃ التوبہ کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھا کہ اس کا تسلسل بھی قائم رہے اور یہ ایک الگ سورت بھی نظر آئے۔ یہ بہرحال ایک ٹیکنیکل سی بات ہے۔ قرآنِ کریم کے مفہوم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قرآنِ حکیم شروع سے آخر تک ایک مربوط کتاب ہے

قرآنِ کریم جیسا کہ آپ دیکھیں گے‘ الحمد سے والناس تک‘ ایک مسلسل مربوط کتاب ہے‘ سورتوں کے یہ الگ الگ نام حوالوں کی آسانی کے لیے ہیں‘ جیسے آیتوں کے الگ الگ نمبر ہیں۔ اسی طرح قرآنِ کریم کو جو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا ہے‘ تو اُن کی بھی کوئی خصوصیت نہیں ہے‘ یہ محض تلاوت کی غرض سے‘ اور خاص طور پر حفاظ نے اپنی آسانی کے لیے‘ قرآن کو حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصے کا نام ایک پارہ رکھ دیا۔ پاروں کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے سورتوں کے الگ الگ نام بھی حوالوں کی‘

سہولت کی غرض سے ہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ ملتے ہیں اور ویسے بھی ہم مسلمان جو کام بھی کرتے ہیں‘ اس سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں‘ اس اعتبار سے بھی یہ ہے کہ یہ بڑے اہم سے الفاظ اور اہم سا ٹکڑا ہے۔ بعض احباب اور علماء کا خیال ہے کہ یہ بذاتِ خود ایک آیت ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی سورت کی آیتوں کا نمبر شمار کرتے ہیں تو اسے پہلی آیت کہتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ نہیں‘ سورت تو اپنی پہلی آیت سے شروع ہوتی ہے اور یہ بسم اللہ کے الفاظ ہر سورت کے اوپر تبرکاً لکھے جاتے ہیں لیکن سورت یہ ہو یا وہ ہو‘ یہ حقیقت ہے کہ قرآنِ کریم کے اندر سورۂ النمل میں یہ الفاظ اسی طرح سے آئے ہیں۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ ❶ نے ملکہ سبا ❷ (Sheba) کو جو خط لکھا تو اس کا آغاز اس طرح سے کیا: **اِنَّـــهٗ مِـنْ سُـلَيْـمٰـنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ** (27:30)۔ چونکہ یہ الفاظ اسی طرح سے قرآنِ کریم کے متن کے اندر آ گئے ہیں اس لیے یہ الفاظ منزل من اللہ یعنی وحی خداوندی ہیں اور ہمارے لیے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے الفاظ کا حقیقی مفہوم اور اس کی وضاحت

عام طور پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے معنی کیے جاتے ہیں: ''میں شروع کرتا ہوں پاک نام اللہ کے‘ جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔'' بسم اللہ میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس کے معنی ''شروع کرتا ہوں'' ہوں۔ ان معانی کے لیے اس سے پہلے ''ابتـــدع'' کا لفظ محذوف مانا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں: ''میں شروع کرتا ہوں۔''

---

❶ تاریخ کا قیاس اس طرف جاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ 950 ق م کا ہے۔

❷ جس زمانے میں قوم سبا اپنے عہد شباب میں تھی اس کی حکمران ملکہ سبا تھی۔ قوم سبا کا مسکن جنوبی عرب (یمن کا مشرقی علاقہ) تھا اور مآرب دارالسلطنت۔ یہ اس زمانے کی مہذب اور طاقتور قوم تھی‘ تجارت میں بہت آگے‘ زمین زرخیز‘ قیمتی دھاتیں‘ جواہرات ریشم اور بخورات کے مسالے بافراط ملتے تھے۔ ہندوستان کا مالِ تجارت یمن کے ساحل پر جا کر اترتا‘ وہاں سے یہ لوگ اس سامان کو شام‘ فلسطین اور مصر تک لے جاتے۔ تجارت اور اس کے ساتھ حکومت‘ نتیجہ یہ کہ شمالی عرب اور افریقہ تک مختلف آبادیوں پر ان کا تسلط رہا۔ قریب 1100 ق م‘ زمانہ عروج سمجھئے۔ پہلی صدی ق م میں یہ قوم تباہ ہوگئی۔ ان کی بستیوں کے کھنڈرات اور ان کے کتبات آج تک ان کی مٹی ہوئی سطوت کی زندہ شہادتیں ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے اور قلعے تعمیر کرتے تھے اور آبپاشی کے لیے انہوں نے بڑے بڑے بند (Dams) بنا رکھے تھے۔ چنانچہ ایک بہت بڑا بند خود دارالسلطنت مآرب کے قریب تھا جسے سدمآرب کہتے ہیں۔ (حجاز کے عرب بند (Dam) کو ''سد'' اور عرب یمن عرم کہتے ہیں) یہ بند (Dam) پہاڑوں کے اندر بڑی بڑی دیواریں کھینچ کر بنایا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اردگرد کا علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے یہ سرزمین وسیع و عریض باغ بن گئی تھی۔ پہلے یہ بند ٹوٹا‘ جس سے شہر تباہ و برباد ہوا اور گردوپیش کا علاقہ ایسا ویران ہوا کہ اس میں جھاؤ اور خاردار بیریوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا (34:16-17) حوالہ: پرویزؒ: برق طور‘ ادارہ طلوع اسلام‘ لاہور‘ 1993‘ ص ص 261-259

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے ''اقراء'' کا لفظ محذوف ہے کیونکہ سورۃ العلق میں آیا ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (96:1)۔ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز اس آیت سے ہوا تھا' جس میں حضور ﷺ سے کہا گیا تھا'' کہ تو پڑھ ساتھ پاک نام اپنے رب کے' جس نے پیدا کیا۔'' اس آیت کا صحیح مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔ بہرحال کہنا یہ مقصود تھا کہ بسم اللہ کے معنی کیے جاتے ہیں :''میں شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ کے'' اور اس میں چونکہ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کے معنی ''میں شروع کرتا ہوں'' ہو' اس لیے مانا یہ جاتا ہے کہ اس سے پہلے یہ الفاظ تھے اور وہ محذوف ہیں' پڑھے نہیں جاتے' اُن کا مطلب یہی لیا جائے گا۔ لیکن اگر ذرا گہرائی میں جایا جائے تو اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نہ تو اس سے پہلے کوئی لفظ محذوف ہے اور نہ ہی اس کے معنی ''میں شروع کرتا ہوں'' ہیں' کیونکہ بسم اللہ میں ''ب'' کا حرف آیا ہے۔ اس کے معنی ''ساتھ'' کیے جاتے ہیں: ساتھ نام اللہ کے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے معنی ''ساتھ'' بھی ہیں لیکن جیسا کہ آپ تعارفی درس میں سن چکے ہیں کہ عربی زبان میں تو ایک ایک لفظ بلکہ بعض اوقات ایک ایک حرف کے بھی متعدد معنی ہوتے ہیں اور اُن میں سے ہمیں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون سا معنی موضوع' مفہوم اور مضمون کے اعتبار سے اس آیت میں صحیح طور پر فٹ (Fit) بیٹھتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کوئی لفظ محذوف نہ مانا جائے تو پھر ''ب'' کے معنی ''ساتھ'' کے بجائے دوسرے لینے چاہئیں اور ''ب'' کا دوسرا اہم معنی ''مقصد' غایت'' ہے۔ یعنی ''میں یہ جو کچھ کر رہا ہوں یا کرنا چاہتا ہوں' وہ اس مقصد کے لیے ہے' اُس کی غایت یہ ہے' اُس کا سبب یہ ہے' اُس کی علت یہ ہے' میں یہ اُس لیے کر رہا ہوں''۔ اب یہاں تو بات صاف ہوگئی کہ بسم اللہ کے معنی یہ ہوئے کہ میں ''جو کچھ بھی کر رہا ہوں یا جو کچھ اُس کے بعد کہا جائے گا' اُس کا مقصد' اُس کی غایت' اُس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بات آگے آئے گی''۔ دوسرا یہ کہ حرف ''ب'' کے ساتھ جو پہلا لفظ آیا ہے' وہ ''اسم'' ہے۔ ''اسم'' کا ترجمہ عام طور پر ''نام'' کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک تو ذاتی نام ہے جسے اللہ کہتے ہیں یعنی ذاتِ خداوندی کا نام اور باقی تمام اللہ کی صفات ہیں۔ صفت کے لیے عربی زبان میں لفظ ''اسم'' آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ''اسم'' کا مادہ ''س م و'' ہے تو اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں: ''کوئی ایسی علامت جس سے متعلقہ چیز پہچانی جائے''۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی حقیقت تو انسان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔ یہ برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے متعلق تو ہم کچھ نہیں جان سکتے لیکن اس نے اپنی جو صفات بیان کی ہیں' ان صفات کا ایک تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ یہ صفاتِ خداوندی اسماء الحسنٰی کہلاتی ہیں۔ سورۃ الحشر میں مختلف صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (59:24) خدا کی تمام صفات نہایت حسن و خوبی سے کامل توازن لیے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک بسم اللہ میں ''اسم'' سے مراد صفتِ خداوندی ہے' اسمائے خداوندی۔ اس کے بعد بسم اللہ میں دوسرا لفظ ''اللہ'' آتا ہے۔ میں

نے ابھی ابھی عرض کیا ہے کہ اللہ تو خدا کا ذاتی نام ہے۔ بسم اللہ کے معنی ہوئے: ''اللہ کی اُس صفت یا اِن صفات کے مقصد یا غرض کے لیے یہ کام شروع کیا جاتا ہے یا یہ کچھ کیا جاتا ہے۔''

عزیز برادران! بسم اللہ کے بعد رحمٰن اور رحیم کے دو الفاظ آئے ہیں۔ یہ خدا کے دو اسماء ہوئے' یہ خدا کی دو صفات ہوئیں جن کے لیے ''یہ کچھ کیا جائے گا''۔ ان معانی کی رو سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''جو کچھ اس کے بعد کہا جائے گا یا کیا جائے گا' اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفاتِ رحمانیت اور رحیمیّت کا ظہور اور نمود ہو یعنی یہ صفاتِ خداوندی مخصوص طور پر بروئے کار آ جائیں۔ جب قرآنِ کریم کی کسی سورت کے آغاز میں آنے والے ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے متعلق ایسا فرمایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''خدا کا ارشاد یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن یا قرآنِ مجید کی اس آیت کو یا اس سورت کو اس لیے نازل کیا ہے کہ ''ہماری صفتِ رحمانیت اور رحیمیّت کی عام نمود ہو جائے''۔ اور جب ایک مردِ مومن' ایک مسلم' ایک مسلمان' اپنے کسی کام کی ابتدا ان الفاظ سے کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''میں اس کام کو اس لیے ہاتھ میں لے رہا ہوں کہ اس سے خدا کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کی نمود ہو جائے۔'' یہ بسم اللہ کی غایت' خدا کی صفتِ رحمانیت و رحیمیّت' کو عملاً بروئے کار لانا ہے۔

خدا تعالیٰ کے نزدیک نزولِ قرآن کا اصل مقصد

اب سوال یہ سامنے آئے گا کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیّت کا مفہوم اور مقصود کیا ہے؟ یوں تو خدا کی تمام صفات اپنے اپنے مقام پر یکساں عظمت اور اہمیت کی حامل ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جن صفات کو خدائی پروگرام اور اس کی ابتدا میں انسان کے پروگرام کی غرض و غایت بتایا گیا ہو' وہ خاص اہمیت کی حامل ہوں گی۔ لہٰذا یہ دونوں صفاتِ خداوندی' رحمٰن اور رحیم' بڑے گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ پہلے تو میرا یہ خیال تھا کہ میں اسی مقام پر ان کا قرآنی مفہوم واضح کر دوں لیکن آگے چل کر جب ہمارے سامنے سورۂ فاتحہ کی پہلی اور دوسری آیتیں آئیں گی تو وہاں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے بعد اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ آئے گا۔ چونکہ یہ الفاظ وہاں آتے ہیں' اس لیے ان کے مفہوم کے بیان کا صحیح اور مناسب مقام وہی ہے۔ اس کے لیے آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر آپ صرف اتنا سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم نازل فرمایا ہے تو اس کا بھی مقصد یہ ہے کہ انسانی دنیا میں اس کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیّت عام ہو جائے اور اس کے بندے جس پروگرام کو بھی ہاتھ میں لیں اس کی غرض و غایت بھی یہی ہونی چاہیے۔ بنابریں' اس وقت میں جو اپنی بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم کے معانی اور مطالب بیان کر رہا ہوں اور آپ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ اللہ کی ''رحمت'' کا عام ظہور ہو جائے۔ میرے پیشِ نظر بہرحال یہی

مقصد ہے اور یہی میری تمام کوششوں کا منتہیٰ ہے۔ جب آگے چل کر رحمٰن اور رحیم کا مفہوم آپ کے سامنے آئے گا تو پھر اُس وقت آپ سمجھ جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ جھوم اٹھیں گے کہ یہ جو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہیں تو یہ کتنے بڑے پروگرام کا' کتنے عظیم مقصدِ حیات کا' اعلان ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ الفاظ صرف دہرانے کے نہیں ہیں بلکہ یہ ایک پروگرام ہے جس کو عملاً بروئے کار لانا امتِ مسلمہ کا فرض ہے اور اُس میں تعاون اور شرکت کرنا ہر عبدِ مسلم کا فریضہ حیات ہے تو یہ ہوئی بات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی! اب اس کے بعد ہمارے سامنے سورۃ فاتحہ آتی ہے۔

سورۃ فاتحہ کی حیثیت قرآنِ حکیم کے 'پیش لفظ' کی سی ہے

سورۃ فاتحہ یوں کہیے کہ جیسے کسی کتاب کا Preface (پیش لفظ) ہوتا ہے Introduction (تعارف) ہوتا ہے۔ اس سورت کی سات چھوٹی چھوٹی آیات میں اگر یہ کہا جائے کہ واقعی قرآنِ کریم کی تعلیم کا ملخص سمٹ کر آ گیا ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ یہ بڑی ہی جامع سورت ہے اور قرآنِ کریم کا Opening (افتتاحیہ) اسی قسم کی سورت سے ہونا چاہیے اس لیے ہم اس کی پہلی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) سے شروع کرتے ہیں۔

ذاتِ خداوندی کے متعلق غیر مسلموں کا ایک اعتراض جو غلط فہمی پر مبنی ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ آپ نے دیکھا ہے' اس کا پہلا لفظ ''الحمد'' ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) کے عام طور پر معنی کیے جاتے ہیں ''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو پالنے والا ہے سارے جہانوں کا''۔ میں ترجمہ اور اس کے مفہوم کے متعلق تو بعد میں عرض کروں گا' پہلے میں اُس اعتراض کو لیتا ہوں جو غیر مسلم بالعموم اس مفہوم یا اس ترجمہ کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہم مسلمانوں کا خدا (معاذ اللہ) عجیب ہے' جو خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تمام تعریفیں میرے لیے ہیں۔ اِن لوگوں کے کہنے کے مطابق' اس کا اپنے منہ سے خود اپنے متعلق ایسی باتیں کرنا' زیب نہیں دیتا۔ اُن کا یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وحی خداوندی کے ذریعے' جو قرآن کے اندر محفوظ ہے' درحقیقت انسانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ایسا کہیں اور ایسا کریں۔ یہ ہدایت ہے۔ یہ Doctrines [1] ہیں' جو خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں۔ لہٰذا ''الحمد'' سے مراد یہ نہیں کہ خدا اپنی تعریف آپ کرتا ہے۔ وہ تو اِس سے مستغنی ہے۔ اُس نے انسانوں سے کہا ہے کہ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو اور اِسے ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھو کہ ساری ''حمد''

---

[1] تعلیمات یا کسی خاص موضوع سے متعلق تعلیمات کا مجموعہ یا نظام۔ (حوالہ: ڈاکٹر جمیل جالبی: قومی انگریزی۔ اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' 1992' ص607۔

خدا کے لیے ہے۔ اصل یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم کے شروع میں ہی ایک لفظ ''قل'' مان لیا جائے کہ ''کہو'' تو اُس کے بعد جو سارا قرآن کریم ہے' اس کے متعلق یہ کہا جائے گا' یہ سمجھا جائے گا کہ خدا نے انسانوں سے کہا ہے کہ ''تم ایسا کہو' ایسا کرو'' لہٰذا اس اعتبار سے غیر مسلموں کا وہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا۔

لفظ 'حمد' کے قرآنی مفہوم کی شرط اول

اب آیئے حمد کی طرف۔ جیسا کہ ابھی میں نے ترجمے میں کہا ہے اور ہر ترجمے میں یہ آپ کو ملے گا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے یعنی حمد کا ترجمہ ''تعریف'' کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ قرآن کے مفہوم کو صحیح طور پر واضح نہیں کرتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے تعارفی درس میں' میں عربی زبان کی وسعت اور جامعیت کی حقیقت [1] اقتباسات سے بیان کر چکا ہوں۔ تعریف کے لیے عربوں کے ہاں اور الفاظ بھی ہیں۔ خود تعریف بھی تو عربی زبان کا لفظ ہے لیکن قرآن کریم میں وہ الفاظ خدا کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ''حمد'' کا لفظ ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کو سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ حمد کے معنیٰ کیا ہیں؟ اور اس لفظ کو کن معانی میں استعمال کرتے ہیں؟ زمانہ نزولِ قرآن کی عربی میں اس کا مفہوم کیا لیا جاتا تھا؟ جب وہ مفہوم سامنے آئے گا تو پھر آپ دیکھیں گے کہ خدا کے لیے یہی لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ''سب تعریف خدا کے لیے ہے۔'' اس کا مفہوم کہیں بلند اور اس سے کہیں وسیع تر ہے۔ عربوں کے ہاں کسی نہایت حسین' متناسب' نادر شاہکار (Master Piece) کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذباتِ تحسین 'جو Appreciation (ستائش) کے جذبات' بے ساختہ بیدار ہوں' اور خود دل سے اٹھیں' تو ان کے والہانہ اظہار کو ''حمد'' کہا جاتا ہے۔ ویسے تو انہی الفاظ سے آپ سمجھ لیجیے کہ ''حمد'' کے معنیٰ کیا تھے لیکن اس کے لیے وہ چند شرائط عائد کرتے تھے کہ ''حمد'' کن چیزوں کی کی جائے گی اور کس انداز سے کی جائے گی۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ جس حسن و رعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہیے۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذباتِ تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف' اس کی ان تصاویر کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں' جو مرئی (Visible) طور پر ہمارے سامنے آ جائیں۔ اس لیے قرآن کریم نے اُن نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے' جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کیے' اپنی ستائش چاہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ **يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا** (3:187) یہ وہ لوگ

---

[1] اس کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: (ص ص 20 تا 26)' مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

ہیں' جو چاہتے ہیں کہ اُن کی تعریف اُن کاموں کی بنا پر کی جائے' جنہیں وہ کرتے نہیں ہیں۔ لہٰذا محض کسی نظریہ یا کسی Idea (خیال و تصور) یا کسی قسم کے تصور کے لیے ''حمد'' کا لفظ نہیں بولا جائے گا۔ وہ Ideal 'وہ نظریہ' وہ تصور' جب عملی شکل میں' محسوس پیکر میں' سامنے آئے گا' تو اس وقت اس کی تحسین وستائش کے لیے ''حمد'' کا لفظ بولا جائے گا۔ اس سے پہلے نہیں بولا جائے گا۔ یہ ہے پہلی شرط۔

''حمد'' اور ''مدح'' میں بنیادی فرق

دوسری شرط یہ ہے کہ کسی کی جس بات یا جس کام کی ''حمد'' کی جا رہی ہو' وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیے۔ بے اختیاری یا مکینکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہو جانا ''حمد'' کا مستحق نہیں بناتا حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو' یعنی وہ اُس کا اپنا اکتسابی (Acquired) نہ ہو' اُس کے لیے بھی ''حمد'' کا لفظ نہیں بولا جاتا' مدح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے یہ ہیں کہ ''رقصِ طاؤس'' میں' یعنی مور کے ناچ میں' طاؤس یعنی خود مور' مستحقِ حمد نہیں ہوتا' اُس کا خالق ''مستحقِ حمد'' ہوتا ہے۔ رقصِ طاؤس میں طاؤس ''مستحقِ مدح'' ہوتا ہے اور اُس کا خالق یعنی خدا سزاوارِ حمد ہوتا ہے' اس لیے کہ طاؤس کا رقص اُس کی اپنی کسی کاریگری کا نتیجہ نہیں ہوتا وہ اُس کی فطرت کے اندر ہوتا ہے' از خود سرزد ہوتا ہے لیکن خدا نے وہ خصوصیت پیدا کی ہے اس لیے خدا ''مستحقِ حمد'' ہے اور طاؤس ''مستحقِ مدح'' ہے۔

''حمد'' کے لیے تیسری شرط

تیسری شرط یہ ہے کہ ''حمد'' کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ''حمد'' کرنے والے کے دل کی آواز ہو۔ کسی کے دباؤ میں اُس کی تعریف کرنا ''حمد'' نہیں' مدح کہلائے گا' نہ ہی ''حمد'' میں ملمع کاری' نمائش' منافقت یا کسی کو بنانے کے لیے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ ''حمد'' میں جذباتِ تحسین بے ساختہ زبان پر آ جاتے ہیں۔ یوں کہیے کہ کسی مصور کے نادر شاہکار کو دیکھ کر' مونا لیز (Mona Lisa) [1] کے تبسم کو دیکھ کر' بے ساختہ زبان سے آہا ہا نکل جائے' اسے ''حمد'' کہا جائے گا۔ اس میں تصنع نہیں' آورد نہیں' بناوٹ نہیں'

---

[1] Mona Lisa (It is the) most valuable painting and widely recognized as the most famous in the history of Art. The Mona Lisa (La Gioconda) by Leonordo da Vinci (1452-1519) in the Louvre, Paris, France was assessed for Insurance Purposes at $100 million for its move to Washington, Dc, USA and New York City for exhibition from14 Dec. 1962 to 12 Mar. 1963. However, Insurance was not concluded because the cost of the Closest security precautions was less than that of the premuiums. It was painted c. 1503-07 and measures 77x53 cm 30.5x20.9 in. It is believed to portray either Mona (Short for Madonna) Lisa Gherardini, the wife of Francesco del Giocondo of Florence, of Constanza d` Avalos, coincidentally nicknamed La Gioconda, mistress of Giuliano de Medici. King Francis 1 of France bought the painting for his bathroom in 1517 for 4000 gold florins, or 15.3 kg 92 oz of gold. (Mc Farlan, Donald (Ed.): the Guinness Book of Records 1992, Guinness Publishing Ltd. Spain, October 1991. p.180)

دل سے بے ساختہ تحسین وآفریں کے اچھے جذبات کا جو اظہار ہوگا اُسے ''حمد'' کہا جائے گا۔

''حمد'' کی چوتھی شرط

اگلی شرط یہ ہے کہ جس چیز کی ''حمد'' کی جا رہی ہو' اُس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر ''حمد'' نہیں کی جا سکتی۔ مبہم تصورات' دھندلے نقوش' شکوک اور تذبذب پیدا کرنے والے خیالات' کبھی ''حمد'' کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ ''حمد'' فروعی تخیل' تواہم پرستی' اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی۔ اس کا سرچشمہ وہ یقین محکم ہوتا ہے' جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو۔ اگلی شرط یہ ہے کہ جن نفع بخش' کشش انگیز رعنائیوں اور حسن وتناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو' اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ درجہ کمال تک پہنچ چکے ہوں اور اُن کی نفع بخشیاں محسوس ہوں۔ جو آپ خود تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو انسانیت کے لیے نفع بخش نہ ہو' وہ مستحق حمد وستائش نہیں ہوتا۔ آرٹ برائے آرٹ مضرت رساں تو ہوسکتا ہے' سزاوارِ حمد نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ مستحق حمد وہی شے ہوگی جو نوعِ انسانی کے لیے نفع بخشی کا موجب ہوگی۔ یہ ہے لفظ ''حمد'' کا مفہوم۔

دنیا کی کسی زبان میں بھی لفظ ''حمد'' کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا

عزیزانِ من! محاورۂ عرب کی رو سے لفظ ''حمد'' کے اس مفہوم کی روشنی میں آپ بتائیے کہ کیا دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے؟ کیا اردو زبان کا لفظ تعریف یا انگریزی زبان کا لفظ Praise اس مفہوم کا حامل ہوسکتا ہے؟ اور پھر قرآنِ کریم نے تو اس کو الحمد کہا ہے۔ جب اس لفظ پر الف لام یعنی ال آ جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر قسم کی حمدّیت اپنے انتہائی درجے میں صرف خدا کے لیے ہے' اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

''الحمد'' کی وسعتوں کا اندازہ تسخیر کائنات سے ہی ممکن ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات' انسان کے قیاس وخیال وگمان ووہم سے بھی ماوراء ہے' اس لیے اس کی ذات کا محض ذہنی تصور ''حمد'' کے جذبات بیدار نہیں کر سکتا کیونکہ ''حمد'' کی شرط اولیں یہ ہے کہ وہ شے محسوس (Concrete) ہو۔ لہٰذا جس طرح کسی تصویر کی تحسین سے درحقیقت' مصور کی حمد مقصود ہوتی ہے' اسی طرح خدا کی حمد اس کی مخلوق کی رعنائیوں اور نفع بخشیوں کو کام میں لانے ہی سے ہوسکتی ہے۔ اس نے خود کہا ہے کہ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (17:44) کائنات کی ہر شے اپنے خالق کی حمد کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس میں لفظ تصویر بھی آیا ہے۔ اس کا مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی حمد اس کی پیدا کردہ کائنات پر غور وفکر ہی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مومنین کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ حامدون

(9:112) ہوتے ہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ جب حمد خداوندی مظاہر فطرت پر غور وتدبر کی رو سے ہی ممکن ہے تو مومنین کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ اشیائے کائنات پر غور وفکر کریں' کائنات کے مختلف گوشوں میں تحقیقات کریں اور اُن کے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوعِ انسانی کے لیے عام کر کے حمد خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔

اربابِ فکر ونظر کی تعریف قرآنِ حکیم کے آئینہ میں

یہی ہیں وہ اربابِ فکر ونظر' جن کے لیے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (3:189) یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل وبصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں۔صاحبانِ عقل وبصیرت وہ لوگ ہیں جو اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (3:190) اٹھتے بیٹھتے لیٹے ہر آن قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تخلیقِ ارض وسماء پر غور وفکر کرتے ہیں اور جب کائنات کی ان اشیاء میں ریسرچ کرنے کے بعد خالق فطرت کی ندرت کاریاں اور نفع بخشیاں ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آتی ہیں تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (3:190) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس سلسلۂ کائنات کو نہ تو بے مقصد پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لیے۔ یہ ہے خدا کی حمد اور یہ ہیں وہ اربابِ فکر ونظر جنہیں حامدون کہا جائے گا یعنی خدا کی حمد کرنے والے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ [1] علماء کہہ کر پکارا ہے۔

قرآنِ حکیم نے تو اِن ''حامدون'' کو علما کہا ہے

آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے ہاں تو علماء کا تصور ہی کچھ اور ہے لیکن ذرا دیکھیے کہ قرآنِ کریم کن لوگوں کو علماء کہتا ہے۔اُس نے کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (35:27) کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کا نظامِ آب رسانی کس قدر تعجب انگیز اور حکمت انگیز ہے' وہ فضا کی بلندیوں سے بارش برساتا ہے وَاَخْرَجْنَا بِہٖ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا (35:27) اور اس ایک ہی پانی سے طرح طرح کی روئیدگی' پھل' پھول' اناج وغیرہ پیدا کرتا ہے وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ م بِیْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا وَغَرَابِیْبُ سُوْدٌ (35:27) اور کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ یہ پہاڑ' یونہی جامد مادہ کی ساکت وصامت تصویر نظر آتے ہیں' یہ خدا کے نظامِ ارتقاء کی کتنی عظیم الشان نشانیاں اپنے اندر لیے ہیں۔ اِن کی پہچان سے جو کہیں سرخ ہیں' کہیں سفید اور کہیں کالے

---

[1] (35:28)

بھجنگ۔ اِن کی ایک ایک تہہ کتنے کتنے طویل المیعاد ادوار کی تاریخ اپنے دامن میں سمٹائے ہوئے ہے وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ (35:28) اور پھر انسانوں پر، مال مویشی پر، اور کرۂ ارض پر موجود دیگر جاندار مخلوق پر غور کرو کہ یہ کس طرح بے شمار انواع میں بٹی ہوئی ہے اور ان میں کی ہر نوع کس قدر جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔ مگر یہ تمہاری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ تم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اشیائے کائنات کو محض سرسری نظروں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتے ہو لیکن خدا کے بندوں میں سے ارباب علم وحکمت، جب ان پر غور وفکر کرتے ہیں، تو وہ اُس کی عظمت وجبروت کے نشانات کو پا کر پکار اٹھتے ہیں کہ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُ (35:28) درحقیقت خدا کی عظمت سے وہی لوگ کپکپا اٹھتے ہیں، جو اِن اشیائے کائنات پر اتھاہ گہرائیوں سے غور وفکر کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں انہی کو علماء کہا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مومن کا فریضہ تسخیر کائنات کے بعد اس کے محاصل کو کھلا رکھنا ہے

اب آپ غور فرمائیے کہ قرآن کن لوگوں کو علماء کہتا ہے اور ہمارے ہاں یہ اصطلاح کن لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ یہ علماء کا لفظ یوں سمجھ لیجیے کہ جن معنوں میں ہم آج کل سائنٹسٹ کہتے ہیں، ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ انہی کے لیے دوسری جگہ کہا ہے کہ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (45:3) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ نظر آیا کہ مومن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے نظام پر غور وفکر کرے۔ اسی سے فی الحقیقت خدا کی تخلیق پر، خدا کی صفات پر، خدا کی قدرت پر، وہ ایمان پیدا ہوتا ہے کہ جس سے انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ فی الواقع مستحق حمد اسی کی ذات ہو سکتی ہے، کسی اور کی نہیں، اسی لیے اسے مومنین کا فریضہ کہا اور دوسری جگہ ہے کہ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (10:6) وہ لوگ جنہیں متقی کہا جاتا ہے، یہ وہی لوگ ہیں، جو اختلافِ لیل ونہار پر، اللہ تعالیٰ کی کائنات کی تخلیق پر، اور ان تمام چیزوں پر، غور وفکر کرتے ہیں اور یہ چیزیں ان کے لیے خدا کی ذات پر ایمان پیدا کرنے کے لیے نشانیاں بن جاتی ہیں۔ تو علماء بھی یہی ہیں، مومن بھی یہی ہیں اور متقی بھی یہی ہیں۔ اس سے آپ کے دل میں یہ خیال گزرتا ہوگا کہ اِس انداز سے، اس مفہوم کے اعتبار سے، قرآنِ کریم کی اِن شرائط کے اعتبار سے، تو پھر علماء تو خیر یورپ کی اقوام کے سائنٹسٹ ہی ہیں۔ کیا مومن اور متقی بھی وہی لوگ ہوں گے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے اور گہری سوچ کا متقاضی۔

کیا یورپ کے سائنٹسٹ مومن بھی ہیں؟

عزیزانِ من! اشیائے کائنات پر غور کرنے کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآنِ کریم نے خدا کی ''حمد'' کا موجب بتایا ہے۔ یہ ساری چیزیں تو انسان کی طویل زندگی سے متعلق ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اسے سفرِ حیات میں صحیح رہنمائی کی بھی ضرورت ہے اور یہ رہنمائی وحی کی رو سے ملتی ہے، جس کی آخری کڑی قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بھی مظہرِ حمدیت قرار دیا ہے

جہاں فرمایا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا (18:1) ہر قسم کی حمد کی مستحق وہ ذات ہے جس نے اپنے بندے پر ایک ایسا ضابطہ قوانین نازل کیا ہے کہ جس میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں۔ سیدھے راستے پر چلانے والا ضابطہ حیات ہے۔ گویا دو چیزیں ہوئیں جن سے انسان حامد بن سکتا ہے اور قوم حامدون کے زمرے میں آ سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر (Harness) کرے اور دوسرا یہ کہ اُن قوتوں کو وحی کی رو سے بتائی ہوئی اقدار کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے صرف کرے۔ جب یہ دو چیزیں اکٹھی ہوں گی تو وہ قوم ہوگی کہ جنہیں حامدون کے زمرے میں شامل کیا جائے گا۔ ان میں سے اگر ایک چیز بھی کم ہوگی تو وہ حامدون میں نہیں آئے گی۔

نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ حکیم کا خراجِ تحسین

جس ذاتِ اقدس واعظمؐ نے سب سے پہلے اس طرح خدا کی ''حمد'' کو عام کیا اُسے خود اللہ نے احمد کہہ کر پکارا (61:1) یعنی بہت گہرا ''حمد'' کرنے والا اور اسی سے وہ ذات خود محمد ﷺ قرار پا گئی (48:29) یعنی جس کی مسلسل وپیہم ''حمد'' کی جائے۔ اُس کی حیاتِ طیبہ کے یہی عظیم کارنامے ہیں جن کی بنا پر کہا گیا کہ وہ مقامِ محمود پر فائز ہے (17:79)۔ نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے وہ نظام قائم ہوا جسے دیکھ کر ساری دنیا پکار اٹھی کہ فی الواقع مستحقِ حمد وستائش ہے وہ خدا جس نے ایسا انقلاب آفریں نظام عطا کیا اور اس کے بعد سزاوارِ حمد ہے وہ پیغمبرِ انقلاب جس نے اُس نظام کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا۔ اس نظام کا اولیں نتیجہ یہ تھا کہ اس قوم کی جڑ کٹ گئی جو کمزور انسانوں پر ظلم واستبداد روا رکھتی تھی۔ اُس کا یہ وہ نفع بخش کارنامہ تھا جس سے حمدِ خداوندی ابھر اور نکھر کر دنیا کے سامنے آ گئی۔ اس کے پیشِ نظر کہا گیا کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (6:45) ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ گئی اس طرح رب العالمین کی حمد سطحِ عالم پر منقوش ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلاب کے لیے ذاتِ خداوندی کے جلالی گوشے کی نمود بھی ضروری ہوگی یعنی حسنِ تخلیق کی رعنائیوں کے ساتھ غلبہ اور قوت کا مظاہرہ بھی۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے جلال اور جمال، تحسین اور قوت، دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات کو قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (64:1) اقتدار کا سرچشمہ بھی وہی ہے اور ''حمد'' کا سرچشمہ بھی وہی ہے۔ اگر کائنات میں جمالیات کے ساتھ جلالیات کی نمود نہ ہو تو یہ نظام تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری [1]

[ارمغانِ حجاز]

---

[1] ڈاکٹر اقبالؒ (1877-1938) نے ''ضربِ کلیم'' میں اسے یوں کہا:
فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق
پیدا ہو اگر اس کی طبیعت میں ہریری

دوسری طرف جو قوت اقتدار حمدیت کی نذر نہ ہو، وہ فرعونیت اور چنگیزیت بن کر رہ جاتی ہے یعنی.....

''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''

قندیل آسمانی کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اُس میں آسمانی رہنمائی کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے (57:25)۔ ان دونوں کے امتزاج سے نظامِ زندگی قائم رہ سکتا ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں ''اگر قوت کا نگران قرآن نہ ہو، تو وہ چنگیزیت ہو جاتی ہے اور قرآن کے پاس قوتِ نافذہ نہ ہو، تو وہ محض وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔'' لہٰذا جماعتِ مومنین ان دونوں صفاتِ خداوندی کے بروئے کار لانے سے ''حامدون'' بنتی ہے۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ جب، ایک عبد مومن، ایک مسلمان الحمدللہ کہتا ہے، تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ ''حمدیت'' زبان سے چند الفاظ دہرانے کا نام نہیں۔ الحمدللہ، الحمدللہ کہنے سے ''حمدیت'' کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسے نظام کے بروئے کار لانے سے عبارت ہے، جس میں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں آسمانی رہنمائی کے مطابق، نوعِ انسان کی عالم گیر ربوبیت کے لیے، عام کیا جائے اور جو قوتیں اس کی راہ میں حائل ہوں، انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ ہے سورۂ فاتحہ کے پہلے دو لفظ: الحمدللہ۔ مکمل طور پر، ساری کی ساری اپنی انتہائی شکل میں جو ''حمدیت'' ہے، وہ اللہ کے لیے ہے۔ ''حمد'' کے معنی اور مفہوم تو ہم نے سمجھ لیے۔ اس میں اللہ کے لیے کہا ہے کہ یہ خدا کی ذات کا نام ہے، جس کی مختلف صفات الاسماء الحسنیٰ کے انداز میں، قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ اللہ کے کیا معنی ہیں۔

الحمدللہ کے بعد لفظ اللہ کا قرآنی مفہوم

میں سمجھتا ہوں کہ اس مقام پر آپ کے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ اللہ کا لفظ تو اتنا عام ہے، اتنا معروف ہے، اس قدر استعمال میں آتا ہے، کہ ہم ایک ایک لفظ کے بعد، ایک ایک سانس میں، اس کو بولتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب ہم اللہ کہتے ہیں، ہمارا اس پر ایمان ہے، وہ خدا ہے، تو اس کے مفہوم سمجھنے میں کیا دقت ہوگی اور اس کی اتنی لمبی چوڑی ضرورت کیوں پیش آئے گی لیکن جب آپ کے سامنے اس کا مفہوم آئے گا تو آپ پھر مجھ سے متفق ہوں گے کہ اتنا ہی نہیں کہ اس کی ضرورت کیوں تھی، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے، اس کے جاننے کی اشد ضرورت ہے۔

دنیا کے سیاح اور مغربی محققین اگر کسی ایسے علاقے میں بھی پہنچے ہیں، جہاں اُن سے پہلے کسی باہر کے انسان کے نقوشِ قدم تک

دکھائی نہیں دیئے اور وہاں کے باشندے تہذیب وتمدن سے قطعاً نا آشنا تھے' وہ ابتدائی دورِ زندگی یعنی ابتدائی دورِ جہالت کی زندگی' بسر کر رہے ہیں تو اگرچہ وہ اپنی طرزِ بود وباش اور اندازِ معیشت ومعاشرت کے ہر گوشے میں باہر کی دنیا سے مختلف تھے' بایں ہمہ ان کے ہاں بھی کسی غیر مرئی بلند وبالا قوت کا تصور پایا گیا' جس کی وہ پرستش کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک اور حقیقت بھی سامنے آئی۔ وہ یہ کہ جہاں اس قسم کی ہستی کا ایک خاص مقام ہر جگہ موجود ہے مگر اس کا تصور یا تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں اور یہی وہ اختلافات ہیں جہاں ہر قبیلے کا خدا دوسرے قبیلے کے خدا سے مختلف ہے اور ہر مذہب کا معبود دوسرے مذاہب کے معبود سے جداگانہ ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رحمٰن بھی وہی اور رحیم بھی وہی ہے' یہ حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے اور فریب تخیل ہے' یا دانستہ شوبیت ہے۔ یہودیوں کا یہودا' عیسائیوں کا فادر' ہندو دھرم کا ایشور' یا اُن کے ویدان کا پرماتما' مجوسیوں کا یزداں' یہ تمام ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں اور قرآن کا اللہ ان سب سے الگ ہے۔

ہر مذہب کا خدا دوسرے مذہب کے خدا سے مختلف کیوں؟

برادرانِ عزیز! ان مذاہب کے بانیوں نے جنہیں ہم زمرۂ انبیائے کرامؑ میں شمار کر سکتے ہیں' دین کے بانی نہیں' بلکہ دین خداوندی کے پہنچانے والے کہا جائے گا' خدا کی وہی صفات بیان کی ہوں گی جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں لیکن بعد میں اُن میں انسانی خیالات وتصورات کی آمیزش ہوگئی اور اس طرح مختلف مذاہب کے خدا نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے بلکہ خدا کے حقیقی اور منزہ تصور سے بھی جداگانہ تصور کے پیکر بن گئے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ** (6:100) یہ لوگ خدا کے متعلق جو تصور پیش کرتے ہیں' وہ اس سے بہت بلند وبالا ہے اور خدا کا تصور وہی صحیح ہوسکتا ہے' جسے اس نے خود پیش کیا ہے' اور یہ تصور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ جب تک خدا کا کوئی تصور ہمارے سامنے نہیں آتا' اس لفظ کا مفہوم ہمارے سامنے نہیں آتا' دین کی بنیاد ہی استوار نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ اللہ کے لفظ کا مفہوم کیا ہے؟

آپ کو یاد ہے کہ میں نے الحمدللہ میں کہا تھا کہ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب کسی لفظ سے پہلے الف لام (ال) لگا دیا جائے تو اس کے معنی ایک تو یہ ہوتے ہیں کہ ہر قسم کی وہ صفت اسی میں پائی جاتی ہے' دوسرا یہ ہوتا ہے کہ وہ صفت بلند ترین درجے کی' غایت درجے کی' انتہا درجے کی' اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا اس انداز کی صفت کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے جب ہم اللہ کہتے ہیں تو یہ ہے: **ال الٰہ**. اس کے معنی یہ ہوں گے کہ الٰہ کوئی اور نہیں ہوسکتا' الٰہ صرف اللہ ہوسکتا ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ

'تو آپ دیکھیے کہ وہی بات ہوگئی کہ کوئی الٰہ نہیں ہوسکتا سوائے اللہ کے۔ تو آپ دیکھیے کہ الٰہ کے بنیادی معنی کیا ہیں؟ الٰہ کا مادہ ہے: ا ل ہ. اور اس میں بنیادی طور پر متعدد معانی پائے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا یہ ہے کہ گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا اُسے پناہ دینا' دوسرے یہ کہ متحیر ہونا' تیسرے یہ کہ بلند مرتبہ اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا اور چوتھے' جو بنیادی چیز ہے' یہ کہ کسی کی غلامی یا محکومیت اختیار کرنا یعنی کسی کا غلبہ اور اقتدار تسلیم اور قبول کرنا۔ الٰہ کے معنی ہوتے ہیں: صاحبِ اقتدار' صاحبِ اختیار۔ اور اس کے معنی ہوتے ہیں ''وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔'' لہٰذا جب ہم کہیں گے کہ لا الٰہ الا اللہ تو اس کے معنی ہوں گے کہ دنیا میں' کائنات میں' کوئی صاحب اقتدار نہیں سوائے اللہ کے۔ تو اب یہ جو خصوصیت ہے' جسے آپ الوہیت کہہ لیجیے یعنی صاحبِ اقتدار ہونا' حاکم ہونا' وہ جس کی اطاعت کی جائے' وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے' خدا کے سوا کائنات میں کوئی اور نہیں ہے۔ تو آپ دیکھ لیجیے کہ اس میں کس قدر اتفاق پایا گیا۔ اس میں توحید کا کس قدر گہرا مقصد سامنے آ گیا اور اس سے یہ بھی بات سامنے آئی کہ ہمارا اور خدا کا تعلق کیا ہے۔

عقل انسانی ذاتِ باری تعالیٰ کا ادراک کر ہی نہیں سکتی

میں نے یہ اس لیے دوبارہ کہا ہے کہ ذاتِ خداوندی کے متعلق تو ہمارے قیاس اور خیال اور گمان اور وہم میں بھی کچھ نہیں آ سکتا۔ اس نے کہا ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَار (6:104) انسانی بصیرت' انسانی فطرت' انسانی آنکھیں تو ایک طرف رہیں' اس کی بصیرت اور اس کی فکر بھی خدا کے متعلق صحیح طور پہ کچھ نہیں معلوم کر سکتی۔ جو کچھ خدا نے خود بتایا ہے' اس کے متعلق وہی کچھ ہم جان سکتے ہیں۔ اس کے سوا' اس کے علاوہ' کچھ نہیں جان سکتے۔ لہٰذا الٰہ کے معنی یہ ہو گئے: وہ جس کی محکومیت اختیار کی جائے۔ اللہ کے معنی ہو گئے کہ صرف اس کی محکومیت اختیار کی جائے گی' کسی اور کی محکومیت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ کہا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں' جتنے بھی خدا کو ماننے والے ہیں یا اقرار کرنے والے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں' اُن کا اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو مان لینا ایمان نہیں کہلا سکتا' اُن کا ایمان قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ ان سب سے خواہ وہ اہل کتاب ہوں' خواہ وہ کفار ہوں' خواہ وہ مشرکین ہوں' اُن سب کے متعلق کہا ہے کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (2:137) اگر یہ لوگ اس طرح خدا پر ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔

اصل سوال اللہ تعالیٰ کے اس تصور کا ہے جسے خود قرآن پیش کرتا ہے

اب یہاں پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ خدا تو کسی کے سامنے نہیں آتا' ہم اُس کی آواز بھی نہیں سن سکتے' اُس کو دیکھ بھی نہیں سکتے' تو اس کی محکومیت کس طرح اختیار کی جائے گی؟ یہ چیز ہے جو اصلِ دین ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ محکومیت کسی شخص کی اختیار نہیں کی جائے گی۔

محکومیت قوانین کی اختیار کی جائے گی' احکام کی اختیار کی جائے گی' خدا کے الٰہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کے لیے احکام وقوانین دینا' صرف خدا کے لیے ہے۔ دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے کو اپنے حکم یا اپنے قانون کا محکوم نہیں بنا سکتا۔ اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اگر کوئی شخص اس دعویٰ کو مانتا ہے یا اس کی تعمیل کرتا ہے' تو وہ خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ خدا نے اسی لیے کہا ہے کہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا (18:26) خدا نے اپنے حقِ حکومت میں کسی دوسرے کو شریک نہیں کیا' کوئی اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ اس کے جو آداب وقوانین ہیں' جسے ہم کہیں گے کہ وہ الوہیت کے مظہر ہیں' جو وہ قوانین ہیں' جو وہ احکام ہیں' جو وہ اقدار ہیں' وہ تمام قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور یہی چیز ایمان اور کفر میں خطِ امتیاز ہے' چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44) جو شخص بھی خدا کے نازل کردہ قوانین واحکام واقدار کی اطاعت نہیں کرتا' اُن کی محکومیت اختیار نہیں کرتا' اُن کے مطابق فیصلے نہیں لیتا' تو یاد رکھیے! انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مومن یا ایمان لانے والا وہ ہے' جو صرف خدا کو الٰہ مانے' یعنی صاحب اقتدار مانے' صرف اس کے عطا کردہ' نازل کردہ' قوانین واحکام کی محکومیت اختیار کرے۔ اس کے سوا اگر کسی اور کی بھی محکومیت اختیار کی' کسی اور کو صاحب اقتدار' مان لیا تو وہ حقیقت میں اُسے الٰہ مان لینا ہوگا۔

اقدار باری تعالیٰ میں کسی دوسری قدر کو شامل کرنا شرک ہے

عزیزانِ من! اب اس اعتبار سے وہ اللہ (ال الٰہ) نہیں رہے گا بلکہ ہم اس کے ساتھ کسی اور کو بھی الٰہ مان لیں گے۔ اللہ کا نام جپنا یا اللہ پر ایمان کا دعویٰ رکھنا اور اس کی صفتِ الوہیت کے اندر' اس کے اقتدار کے اندر' کسی اور کو شامل کرنا' شرک ہوگا۔ یہ خدا پر ایمان نہیں ہوگا' اس کی توحید نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر آپ یورپ کی اقوام کو لیجیے۔ اُن میں چند ایک کے سوا ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ He believes in God[1] کہا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ان کے اس ایمان کو ایمان ہی نہیں مانتا۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے ہاں نظامِ حکومت وہ رائج کر رکھا ہے جو انسانوں کا بنایا ہوا ہے' وہ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں' خواہ وہ کسی ایک فرد کا بنایا ہوا قانون ہو جسے آپ ڈکٹیٹر کہہ لیں' جسے پرانے زمانے میں بادشاہت یا ملوکیت کہا جاتا تھا اور خواہ وہ انسانوں کے کسی ایک گروہ کا بنایا ہوا قانون ہو' جسے آپ جمہوریت کہتے ہیں۔ ڈیموکریسی کہتے ہیں' مغرب ہی میں نہیں بلکہ آج تو ساری دنیا میں یہی نظام چل رہا ہے۔ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ حقیقت میں اس نظام کو

---

[1] وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے۔

سیکولرازم کہا جاتا ہے یعنی دعویٰ یہ کرنا کہ ہم خدا کو مانتے ہیں لیکن نظام حکومت انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلتا ہے اور اس باب میں بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ جمہوریت بہترین نظام ہے یعنی ایک فرد کا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ ایک گروہ کا بنایا ہوا قانون ہے' جن کو قانون بنانے والوں میں اکثریت حاصل ہوتی ہے تو قرآن تو اس کو ایمان مانتا ہی نہیں ہے۔ وہ ایک شخص کے قوانین ہوں 'اکثریت کے قوانین ہوں' بلکہ تمام انسانوں کے مل کر متفق علیہ قوانین ہوں' وہ اس کو تو خدا پر ایمان مانتا ہی نہیں۔ ❶

خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کے قانون کا اعتراف اور انسانی زندگی میں اُس کے آئین سے انکار کیوں؟

خدا پر ایمان تو اسی کا ہے جو اسے الٰہ مانتا ہے' اس کے سوا کسی اور کو الٰہ نہیں مانتا ہے اسی لیے قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ کائنات کو کس نے پیدا کیا' تو یہ کہیں گے خدا نے پیدا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ زمین اور اجرامِ فلکی اور شمس و قمر کس کے قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہیں' تو یہ کہیں گے کہ خدا ہی نے انہیں پیدا کیا ہے اور اسی کے قوانین کے تابع یہ اس طرح سرگرمِ عمل ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اِن سے پوچھو کہ وہ کون ہے جس کے قوانین کے مطابق آسمان سے بارش ہوتی ہے' جس سے زمینِ مردہ حیاتِ نو حاصل کر لیتی ہے' تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کے قوانین سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے اور یہ غور طلب بات ہے کہ جب یہ خارجی کائنات میں قوانینِ خداوندی کی کارفرمائی کو تسلیم کرتے ہیں تو انسانی دنیا میں اس کے قوانین کی ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتے ہیں' یہاں پہنچ کر انہیں کون سی بات دھوکا دے دیتی ہے! فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ (23:84)۔

یہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت ''الحمد'' سے انکاری ہے

ان کی عقل و فکر پر کیوں پردے پڑ جاتے ہیں (29:61) وہ کہتا ہے کہ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (29:63)۔ اُن سے کہو کہ یہ الحمد صرف خدا کے لیے ہے اور اس میں پہلے لفظ حمد آیا تھا۔ تو حمد کے اندر سب سے بڑی چیز تو یہی آتی ہے کہ صاحبِ اقتدار وہی ہے' اختیارات صرف اس کے ہاتھ میں ہیں' حقِ حکومت صرف اس کے قوانین کو حاصل ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ خارجی کائنات میں جتنے Laws of Nature ❷ (قوانین فطرت) ہیں' وہ تو خدا کے بنائے ہوئے ہیں' مگر انسانوں کی زندگی میں ہم اپنے وضع کردہ قوانین کے تابع زندگی بسر کریں گے' صریحاً قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن اسے خدا پر ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا۔

---

❶ اس کی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: پرویزؒ کا پمفلٹ: مقصود بالذات کون ہے؟ فرد یا مملکت۔ اس کا انگریزی ترجمہ اور تدوین پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق کے قلم سے اس نام سے چھپا ہے: What is the genuine end? The Individual or the State یہ پمفلٹ (اردو اور انگریزی) ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' 25 / بی گلبرگ' لاہور' پاکستان سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

❷ قوانینِ فطرت کی سائنسی تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص 315 (فٹ نوٹ 1)

قرآنِ حکیم کی آڑ میں نظامِ سرمایہ داری کی پکار

عزیزانِ من! اس مقام پر ایک بات مجھے یاد آ گئی۔ رشیا[1] نے جب اپنے ہاں وہ نظام جاری کیا تو اس کا Counter (توڑ) کرنے کے لیے سرمایہ داری نظام کو ضرورت پیش آئی کہ وہ اُن کے مقابلے میں مسلمانوں کی تائید حاصل کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کے لیے کیا حربہ استعمال کیا تھا؟ انہوں نے پراپیگنڈہ کیا کہ روس یا کمیونسٹ یا سوشلسٹ خدا کا انکار کرتے ہیں اور مسلمان خدا کو مانتے ہیں۔ انہوں نے پروپیگنڈے میں پہلی چیز تو یہ کی کہ خدا کے انکار کرنے والوں کا خدا کے اعتراف کرنے والوں کے ساتھ کسی طرح سے کسی قسم کے کوئی مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اگلی بات یہ کہی کہ ہم تمام اقوامِ یورپ اور مغرب، جو عام طور پہ عیسائیوں اور یہودیوں پر مشتمل ہے، خدا کو مانتے ہیں۔ مسلمان بھی خدا کو مانتے ہیں، صرف یہ کمیونسٹ خدا کو نہیں مانتے۔ اس لیے انہوں نے اتحاد کے لیے نعرہ دیا کہ:

Believers in God, unite together[2]

آؤ، خدا کے ماننے والو! ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنائیں۔ گویا انہوں نے بھی اپنے آپ کو خدا کا ماننے والا قرار دے کر مسلمانوں کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنانے کی بنیاد قائم کی۔ یہ الگ بات ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی خدا کی الوہیت کوئی نہیں مان رہا لیکن انہوں نے تو کہا کہ ہم خدا کو ماننے والے ہیں۔

قرآنِ کریم تو ایک ایک قدم پہ یہ کہتا ہے کہ محض Laws of Nature (قوانینِ فطرت) یعنی کائنات کے قوانین کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خدا کے ہیں اور سارا نظامِ کائنات اس کے تابع چل رہا ہے اور انسانوں کی دنیا کے اندر یہ کہنا کہ یہاں احکام اور قوانین انسان خود وضع کریں گے، بالکل غلط ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ خدا پر ایمان ہے ہی نہیں۔ اسی لیے میں اسے پھر دہرا دوں جو قرآن نے کہا تھا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) جو خدا کے نازل کردہ قوانین کی محکومیت اختیار نہیں کرتا، وہ اس کے الٰہ ہونے کو نہیں مانتا۔ لہٰذا، عزیزانِ من! ال الٰہ یا اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اسی لیے اسلام کا بنیادی تصور، بنیادی ایمان لا الٰہ الا اللہ پر ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔

ربِ تعالیٰ کے اقتدار کی محسوس شکل وصورت

اب اگلی بات یہ تھی کہ خدا کا یہ اقتدار کس طرح ہمارے سامنے آئے گا، ہم کیسے اس کی محکومیت اختیار کریں گے؟ اس کے لیے یہ

---

[1] سابقہ یو ایس ایس آر (USSR)

[2] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۂ انبیاء، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005ء، ص ص 61 تا 75 بمعہ انہی صفحات کے فٹ نوٹ

کہہ دیا کہ خدا نے جو پیغامات' جو احکام' نازل کیے تھے' محمد رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملے اور وہ آج انؐ کی کتاب کے اندر محفوظ ہیں۔ یوں خدا کی الوہیت پر ایمان لایا جائے گا۔ لہٰذا ''لا الٰہ الا اللہ'' کے ساتھ ''محمد رسول اللہ'' کہہ دیا۔ اس میں دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ بتا دیا کہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا عملی طریق کیا ہے؟ اور وہ طریق ہے ''خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے قوانین کی غایت پورا کرنا'' اور اس میں دوسری چیز یہ اخذ ہو گئی کہ کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں اور تو اور دنیا میں خدا کے بعد عظیم ترین شخصیت محمد ﷺ کی ہو سکتی ہے لیکن محمد ﷺ کی بھی پوزیشن یہ نہیں کہ وہ صاحب اقتدار اور صاحب اختیار ہیں' خدا کی شانِ الوہیت میں شامل ہیں' بالکل نہیں۔ کہا کہ محمد ﷺ بھی اللہ کے رسول ہیں' اس کے احکامات دنیا تک پہنچانے کا واسطہ ہیں' خود احکامات مرتب اور وضع کرنے والے نہیں' اپنی حکومت قائم کرنے والے نہیں' حقِ حکومت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! اللہ پر ایمان کے معنی۔ اس باب میں تو قرآنِ کریم اس قدر گہرائی میں گیا ہے کہ جب اُس پر انسان غور کرتا ہے تو واقعی وجد میں آ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دوسرے انسانوں کے احکام کا اتباع تو ایک طرف رہا' ان کی محکومیت اختیار کرنا تو شرک اور کفر ہے' وہ کہتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (25:43). دنیا میں تم ایسے لوگوں کو دیکھو گے کہ جو کسی دوسرے شخص کے احکام کا اتباع تو شاید نہ کریں یا کریں'' لیکن وہ ہر معاملے میں خود اپنے جذبات کا اتباع کرتے ہیں یعنی وہ اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں۔ اُن کی جو اپنی خواہش ہوتی ہے' وہ اس کا اتباع کرتے ہیں' اپنے جذبات کے ماتحت چلتے ہیں' انہی سے فیصلے کراتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو سب سے بڑا شرک ہے اور جب یہ ایسی چیز ہے تو کہا کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) جو اپنے ہی جذبات سے مغلوب ہو گیا' اپنے ہی جذبات کو اپنا الٰہ بنا لیا' تو پھر اس کی سمجھنے سوچنے دیکھنے بھالنے کی ساری قوتیں مسلوب ہو جاتی ہیں' ان پہ پردے پڑ جاتے ہیں' جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ اس کی ایسی کیفیت ہوتی ہے جیسی ایک شرابی کی ہو کہ اس کی عقل و فکر کچھ کام ہی نہیں دیتی۔ پھر جس کی یہ کیفیت ہو جائے تو اس کے لیے کہا کہ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (45:23) پھر اسے کون صحیح راستے پر لا سکتا ہے!! اس سے آپ نے الا اللہ کے معنی دیکھ لیے کہ قرآنِ کریم اپنے جذبات کے اتباع کو' اپنے جذبات کی محکومیت اختیار کرنے کو بھی' شرک قرار دیتا ہے۔

جذباتی قوت کو استعمال میں لانے کا طریق

یہاں ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قرآن جذبات کو فنا کر دینے کی تاکید کرتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ جذبات تو وہ محرک قوت ہیں' جن سے انسان جتنے کام کرتا ہے' وہ اسی قوتِ محرکہ کی بنا پر کرتا ہے۔ اگر دل کے اندر ہی جذبہ پیدا نہ ہو' اگر آرزو ہی آپ کے ہاں بیدار نہ ہو' تو آپ دنیا کے اندر نہ کوئی تخلیق کر سکتے ہیں' نہ کوئی دنیا کا کام کر سکتے ہیں۔ جذبہ تو نہایت ضروری ہے لیکن جذبات

کو بے زمام چھوڑ دینا' ان پہ کوئی پابندی عائد نہ کرنا' یہ ہے ان کو الٰہ بنانا۔ اسی لیے اس نے کہا ہے وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (28:50) ظالم وہ ہے' مشرک وہ ہے' جو اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور خدا کی دی ہوئی وحی کو چھوڑ رہا ہے۔ ایسی صورت میں مثال یوں لیجیے کہ اگر پانی دریا کے ساحلوں کے اندر بہتا ہوا چلا جائے تو وہ صرف تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے' امیدِ حیات ہے لیکن اگر وہ ان ساحلوں کو توڑ دے تو سیلاب بن جاتا ہے اور سیلاب سوائے تباہی کے کچھ اور نہیں ہے۔ انسانی جذبات کو اگر خدا کی نازل کردہ اقدار' احکام اور قوانین کے ساحلوں کے اندر رکھا جائے گا تو یہ جذبات تعمیری نتائج پیدا کریں گے۔ یہ نہایت ضروری ہے اور اگر انہیں بے بہا چھوڑ دیا جائے' بے لگام چھوڑ دیا جائے' تو یہی دریا سیلاب کی شکل اختیار کرے گا جو تباہیاں ہی تباہیاں بپا کرتا چلا جائے گا۔ یعنی آپ نے اپنا اقتدار' جذبات کے اعتبار پہ' اس طرح تسلیم کیا کہ ان کے اوپر خدا کے قوانین کی حاکمیت باقی نہ رہی۔ اس لیے دنیا میں انسان کو جتنی صلاحیتیں حاصل ہیں' جتنی استعداد حاصل ہے' جو ذرائع اور وسائل حاصل ہیں' اُن سب سے فائدہ اٹھانا' انہیں کام میں لانا' نہایت ضروری ہے بشرطیکہ انہیں خدا کی نازل کردہ اقدار و قوانین کے تابع رکھا جائے۔ اگر تابع رکھا جائے تو یہ عین اسلام ہے اور اگر ان کو بے بہا بنا دیا جائے' ان کے اوپر خدا کے قوانین کا غلبہ نہ تسلیم کیا جائے' تو یہ چیز کفر بھی ہے' شرک بھی ہے' تخریب بھی ہے' دنیا میں ہر قسم کا فساد برپا کرنے والی چیز ہے۔

ارض و سما کا مالک و حاکم صرف باری تعالیٰ کی ذات ہی ہے

عزیزانِ من! دو چیزیں ہمارے سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ صرف یہ سمجھنا کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین چل رہے ہیں' اس نے کائنات کو پیدا کیا اور یہ جو Laws of Nature (قوانین فطرت) ہیں' یہ خدا کے مقرر کردہ ہیں' ان کے مطابق یہ نظام سرگرمِ عمل ہے لیکن ہماری انسانوں کی زندگی میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ چیز بھی خدا پر ایمان لانا نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں واضح طور پہ کہا ہے کہ وَ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84) خارجی کائنات میں بھی وہی الٰہ ہے اور تمہاری اپنی زندگی میں بھی' وہی الٰہ ہے۔ وہی سماء کا الٰہ ہے' وہی ارض کا الٰہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آپ اسے ارض کا الٰہ نہیں مانتے' یعنی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں' خواہ اس کا کوئی بھی گوشہ کیوں نہ ہو' سیاسی ہو' معاشرتی ہو' معاشی ہو' آپ خدا کو الٰہ نہیں مانتے' تو آپ خدا پر ایمان نہیں رکھ رہے ہیں۔ اسی لیے اُس نے کہا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21:22) اگر خارجی کائنات اور خود اس ارضی زندگی میں خدا کے سوا اور الٰہ ہوں تو اس میں فساد برپا ہو جائے یا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یعنی اس کے ایک گوشے میں خدا کے قوانین نافذ ہوں اور دوسرے گوشے میں کسی اور کے' تو کائنات کا سارا سلسلہ تہس نہس ہو جائے لہٰذا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (21:22) اس پوری کائنات کا مرکزی کنٹرول جس میں خود انسانوں کی زندگی بھی شامل ہے' اسی کے ہاتھ

میں ہے۔ وہ ان تصورات سے بہت بلند ہے جو لوگ اس کے متعلق خیالات رکھتے ہیں۔ جو باتیں لوگ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ اُس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! اب آپ نے سمجھ لیا کہ اللہ کا مفہوم کیا ہے اور یہ بھی سمجھ لیا کہ الٰہ کا جو ترجمہ ہمارے ہاں انگریزی میں God ہے، ہندوؤں کے ہاں ایشور، پرماتما ہے، مجوسیوں کے ہاں یزداں ہے، ہمارے ہاں فارسی کا لفظ خدا ہے جو اردو میں عام مستعمل ہے، وہ اللہ کا مفہوم نہیں ادا کر سکتے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا واقعی ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اپنی ذات میں محکم ہے۔ جب یہ لفظ اسی طرح رہے گا، تو اس کا مفہوم آپ سمجھ سکتے ہیں، بیان بھی کر سکتے ہیں لیکن اس کا ترجمہ کسی ایک لفظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ جونہی آپ نے کسی زبان میں ترجمہ کیا، وہ اس زبان والوں کا جو خدا ہے، اس کا تصور آپ کو دے گا، قرآن کے الٰہ کا تصور نہیں دے سکتا۔

خارجی کائنات میں رب تعالیٰ کا قانون اور ارضی زندگی میں انسانی قانون یہ حاکم اعلیٰ کی حکمرانی کے ساتھ جنگ ہے

میں پھر دہرا دوں کہ قرآن کا جو الٰہ ہے، اس کے معنی ''صاحبِ اقتدار'' ہیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ''اللہ کے سوا پوری کائنات میں کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے''۔ پھر اگلی بات یہ ہے کہ یہی نہیں ہے کہ آپ یہ کہیں کہ خارجی کائنات میں یعنی Outer Universe میں تو اس کے قوانین ہیں، جنہیں Laws of Nature (قوانینِ فطرت) کہا جاتا ہے اور انسان کی اپنی زندگی کے اندر اس کے قوانین نہیں بلکہ اس کا نظام تو انسان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع چلے گا تو یہ Dualism (ثنویت) ہے کہ وہاں کا خدا کوئی اور ہے اور یہاں کا الٰہ کوئی اور ہے، تو یہ کفر نہیں، بلکہ شرک ہے حتیٰ کہ انسان اگر اپنے جذبات کے تابع چلتا ہے اور انہیں بھی خدا کے احکام اور اقدار کے تابع نہیں رکھتا ہے، تو یہ خود اپنے جذبات کو الٰہ بنانے والی بات ہے۔ اس میں اللہ پر ایمان کسی طرح بھی باقی نہیں رہتا۔

عزیزانِ من! یہ ہے اللہ کے لفظ کا مفہوم۔ یہ جو سورۃ الفاتحہ کی پہلی ہی آیت الحمدللہ میں ''الفاظ حمد اور اللہ تھے۔ ہمارے سامنے آ گئے۔ اب آگے یہ بات آئے گی کہ خدا کا یہ اقتدار و اختیارِ حاکمیت کس مقصد کے لیے ہے۔ کیا وہ اس لیے ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ ہم حاکم ہیں، ہماری حکومت ہے، تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو، اور تم سرتابی کرنے والے کون ہوتے ہو؟ اس کی غایت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ ان سب سوالات کا جواب اگلے الفاظ ''رب العالمین'' میں آئے گا۔ اس طرح اب اس کا اگلا لفظ ''رب'' ہمارے سامنے آئے گا، جسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

ہمارا ماٹو ''قرآن فہمی اور باغبانی''

قرآن کریم میں ہے:

ما کان لبشران یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ ولٰکن کونوا ربٰنین بما کنتم تعلمون الکتٰب و بما کنتم تدرسون (3:78)

''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین' حکومت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اسکی تعلیم یہی ہوگی کہ تم سب اس کتاب خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبر سے اس کے مغز تک پہنچتے ہو۔ ربانی (یعنی اس کے نظام ربوبیت کے علمبردار) بن جاؤ۔'' (مفہوم القرآن)۔

ربانی معاشرہ ہر قسم کی غلامی کا خاتمہ کر کے ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ جس کی بنیاد الارض للہ ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس

(اقبال)

☆ 2007ء باغبانی کا سال ہے آپ بھی اپنے کردار کا بھرپور عملی مظاہرہ کر کے دکھائیں۔

☆ باغبان حضرات ہر مہینے کی 15-30 تاریخ کو اپنے غیر رسمی اجتماعات میں اپنے تجربات اور معلومات سے دوسروں کو آگاہ کرتے ہیں۔

☆ کاربن۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن پودے ہوا اور پانی سے حاصل کرتے ہیں۔

☆ نائٹروجن۔ فاسفورس۔ پوٹاشیم۔ کیلشیم۔ میگنیشیم اور سلفر 6 عناصر کُبریٰ غذائی ہیں۔

☆ بوران۔ زنک۔ آئرن۔ کاپر۔ میگنیز۔ مولب ڈینم اور کلورین 7 عناصر صُغریٰ غذائی ہیں۔ یہ تمام اجزاء بطور خوراک پودا کھاد مہیا کرنا جدید زرعی ٹیکنالوجی کا حصہ ہیں۔

☆ مرغیوں کی بیٹ بھی کھاد میں پودوں کے لئے مفید ہے۔

☆ پتے۔ گھاس۔ بچا کھچا چارہ۔ سبزیات کے فالتو حصے' باورچی خانے کا بقایا' کھاد کے گڑھے میں ڈالتے رہیں۔

پتہ رابطہ: (1) ملک حنیف وجدانی' صدر باغبان ایسوسی ایشن' سنبل سیداں' نیومری۔ (2) صبینہ یاسمین' سینئر نائب صدر' باغبان ایسوسی ایشن' ٹبی سیداں' سوہاوہ' جہلم۔ (3) محمد افضل ولد عبدالحمید' چک نمبر 215 (تاحیات ممبر)' باغبان ایسوسی ایشن' بورے والا' وہاڑی۔

Muslim Priesthood vs. Human Rights in Islam

By

Mansoor Alam

==========

We proudly proclaim to the world that there is no priesthood in Islam. This is no doubt true. However, we forget to mention that we *do* have a kind of priesthood in our current practice of Islam. Our professional Imams go through a similar process of education, training, and indoctrination as any other religious priest. They lead ritual prayers, give sermons, and conduct religious ceremonies involving birth, marriage, and death. They perform these services mainly under the auspices of a particular school of thought of a religious sect within Islam. Our Imams thus act and behave no differently than other religious priests: promoting and serving their own sect. And Muslims accept this practice without any second thoughts.

If there is no priesthood in Islam then it stands to reason to ask how this pseudo-priesthood entered Islam, and how did it achieve such common currency among Muslims.

By contrast we find no trace of any kind of priesthood in early Islam. Our Prophet (PBUH) did not appoint an Imam per se to lead prayer; nor did the rightly guided caliphs. They all led prayers (as did all other officials of the state) as part of their official duties. The use of full time professional Imams to lead prayers in mosques and to perform religious services, must therefore have come into Islam much later.

If we look at history we find that, after the rightly guided Caliphs, Umayyad and Abbasid rulers needed religious sanction for their dictatorial authority. Initially, Islamic scholars resisted this attempt as it was clearly against the Qur'an (50:45). As a consequence, many paid with their lives. But many others buckled under threat and intimidation and gave the religious sanction the rulers needed for their dictatorial rule. The rulers, after having received the 'Islamic' stamp of approval, happily returned the favor to religious scholars by officially creating a religious institution for them. This new institution was granted religious autonomy as long as it did not cross the line set by the rulers.

This laid the foundation of a kind of Muslim priesthood in Islam which continues till today in one form or the other. Promoted by rulers, religious schools and seminaries flourished. Various pioneers laid the foundation of their own schools of thought, their own jurisprudence or the *Shariah* law; they compiled works of *Ahadith*, *Tafsir*, and Islamic history. Their domain of influence however extended only over religious, moral, and ethical aspects while absolute power rested exclusively with the rulers.

Clearly violating the injunction of the Quran (4:93) the so-called Muslim Caliphs fought many wars among themselves spilling Muslim blood– all in the name of Islam! Family feud was common among them. They conspired against each other to grab power. Great numbers of Muslims (e.g., Mu'tazilites and Kharajites) who dared to challenge the rulers were declared heretics and were exterminated. But while all these political fights continued, the religious schools of thought the reigning ruler belonged to, flourished under his tutelage in areas of the Islamic world he controlled. The movement started by the original scholars to protect Islam (or rather what was left of Islam) during the power struggle of Umayyads and Abbasids (and later among the Abbasids themselves) had developed and matured into different schools of thought, so much so, that they became permanent fixtures in Islam. Consequently, all the mosques were under the control of these newly created autonomous religious institutions, and so were the appointments of Imams. This in brief is how a kind of sectarian-based priesthood became part of Islam. This is why we now have mosques designated for different sects within Islam, unthinkable during Prophets' time or during the time of the rightly guided caliphs.

So what should be done now? Should we simply close our eyes to the Qur'an and allow these latter day rulers and Imams to regurgitate the same old material that was developed under dictatorial rule, and which tramples on the most basic values of the Qur'an dealing with universal *human* rights. Some of the most basic ones among these being: sacrosanct right of sanctity of human life (5:32); inalienable right of freedom of choice (2:256, 18:29); right of tolerance for other faiths (22:40) and absolutely no compulsion in faith (2:256); fundamental right of consultation (3:159, 42:38); universal right of preserving human dignity (17:70); sacrosanct right of equal justice for all (4:58, 4:135, 5:42, 16:90) including enemies (5:8); no bending of justice for anyone (if the Prophet was not above the law (6:15) then how can anyone else be?); right to hold positions based solely on merit (46:19); right of personal responsibility and accountability (53:38); absolute right of ownership of the fruits of one's labor and no free ride for anyone (53:39). Are these Qur'an-guaranteed human rights to both men and

women to be found in our current practice of Islam anywhere not to say of the holiest place in Islam, the birth place of our Prophet (PBUH)?

The situation has deteriorated to such an extent that if we were to mention that the above human rights are some of the most basic ones in Islam; that our Prophet (PBUH) lived and implemented these rights in society; that an Islamic society is supposed to be constituted on the basis of these core values at its heart; then surely it will raise many eyebrows and may even invite ridicule. "Have these human rights anything to do with Muslims and Islam?" many might shoot back with contempt. Maybe they are not entirely to be blamed for this reaction considering how Muslim countries behave these days. Alas! This is the level to which the twin forces of Muslim dictatorship and Muslim priesthood, the self-proclaimed self-appointed custodians of Islam, have brought Islam down to. Who else could be more responsible for distorting the image of Islam in the name of Islam, in the name of the Qur'an, in the name of the Prophet (PBUH)?

The world is judging Islam by *our* practice of Islam, by observing the so-called practicing Muslims. No wonder we are fulfilling the prophecy of the Qur'an by showing to the world that Islam is a failure, that Islam is false (107:1-7) by our behavior! Our failure to live up to true Islam is being seen as failure of Islam. We may think we are good practicing Muslims. We may think that Allah is happy with us. We may think that we have the blessings of Allah. We may even be performing all the pillars with sincerest of devotion. All this is fine. But these are little more than self-deception in the eyes of the Qur'an as long as its true and most profound values dealing with fundamental human rights remain under siege; as long as the Muslim society continues to trample on these rights. How else to describe the situation?

The Prophet (PBUH) is reported to have said that Muslim Ummah is like a body. When any part of the body is in pain the whole body feels it. That body seems to be in critical condition today. The only way to revive it is to go back to the basic Qur'anic values guaranteeing universal human rights and make them the foundation of Muslim society the way our Prophet (PBUH) did more than 1400 years ago, when the rest of the world was living in barbarism and chaos as noted by many historians (see, e.g., J.H. Denison, *Emotion as the Basis of Civilization*). This will be the real miracle of the Qur'an. *This* will be the true Sunnah of the Prophet (PBUH) to practice (7:157). The question is: Do we have the will and the courage to embark on this path? The stars are watching.

==========